إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جنوری ۲۰۲۴ء

مُدِیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 Monthly Al Burhan January 2024

جمہوریت کے تاریک پہلوؤں سے روشناس کرانے والی

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی تازہ تالیف

جمہوریت کی حقیقت

صفحات 500، 20x30 کی بڑی تقطیع مع ڈسٹ کور

ملنے کے پتے

امین اشعر، کراچی
0333-2122756

حافظ محمد عمران طحاوی، لاہور
0300-4107282

مکتبہ البرہان، لاہور

ماہنامہ البرہان لاہور

Since 2010

جلد ۲۸ — شمارہ ۱

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk

جنوری ۲۰۲۴ء/شعبان ۱۴۴۵ھ

آئینہ مضامین

فکرونظر

یک سوال-غزہ: تاریخ لکھی جائے گی	مدیر	۴

تعلیم وتربیت

- علوم اسلامیہ میں تحقیق کی زبوں حالی	ڈاکٹرطفیل ہاشمی	۶
- سوشل میڈیا کے طلبہ وطالبات پر منفی اثرات	زین قریشی	۸
- وحدانی نظام تعلیم	حافظ عتیق الرحمٰن گورچانی	۱۳

فکرودانش

- احیائے اسلام: روداد سیمینار اسلام آباد	حافظ محمد عمران طحاوی	۲۰
- پاکستان میں دینی قوتیں کیوں کامیاب نہیں ہوسکیں؟	مدثر رشید	۳۰

تفہیم دین

- عجم ہنوز نداند رموزِ سرمایہ مفتی تقی عثمانی کی کتاب پر تبصرہ	ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری	۴۴
- فکرِ شیخ الہندؒ کے عصری تقاضے	مولانا زاہد الراشدی	۵۶

تفہیم مغرب

- مغرب کے غلبے کے اسباب کیا ہیں؟	شاہنواز فاروقی	۵۹
- ٹیکنالوجی دنیا کو بدل رہی ہے کیا آپ بھی بدلنے کو تیار ہیں؟	کمانڈر محمود اقبال	۶۴

خطوط

عمران خان کے نام، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ کے نام، مدیر البرہان کے نام	ادارہ	۶۶

یادرفتگان

جسٹس ڈاکٹر محمد الغزالی مرحوم	پروفیسر ڈاکٹر محمد امین	۶۸

عالم اسلام

افغانستان-ترکی-چینی ترکستان-سوڈان	ڈاکٹر انصاری و مدیر	۷۰

English Section ۸۲

Capital and its Crisis — Dr. Javed Akbar Ansari

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر

محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0300-4107282)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِاعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 20,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکر و نظر

ایک سوال

ایک سوال: علماء کرام سے

آپ نے ریاست کے کہنے پر یہ فتویٰ دے دیا کہ طاقت کا استعمال صرف ریاست کا حق ہے اور ہم نے اسے تسلیم کرلیا۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اگر ریاست اپنے شہریوں پر ظلم و ستم کرے اور عدالت بھی اس کی جیب میں ہو تو اس ظلم کے ازالے کی کیا صورت ہو گی؟

ایک سوال: چیف جسٹس آف پاکستان

ہمیں آپ کی یہ بات اچھی لگی تھی کہ سپریم کورٹ میں ان چیف جسٹس حضرات کی تصویریں نہیں ہونی چاہئیں جنہوں نے آئین کی پاسداری نہیں کی۔

تو اب آپ سے درخواست ہے کہ اپنی تصویر بھی کورٹ روم سے ہٹا دیں کیونکہ آپ بھی وہی کچھ کر رہے ہیں جو پہلے چیف جسٹس صاحبان کرتے تھے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ جب ایک مظلوم نے آپ سے انصاف کی درخواست کی تو آپ نے اسے انصاف مہیا کرنے کی بجائے جواب دیا کہ ’’تم مجھے دباؤ میں نہیں لا سکتے‘‘ جبکہ اندھوں کو بھی نظر آ رہا ہے کہ اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ لہٰذا درخواست ہے کہ آپ اپنی تصویر کورٹ روم سے اتار دیں۔ خیال رہے کہ ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

ایک سوال: چیف آف آرمی سٹاف سے

یہاں ہمیں ایک ادبی لطیفہ یاد آ گیا۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید ایک عالم و فاضل شخص تھا لیکن طبع موزوں نہ رکھتا تھا۔ ایک دفعہ موج میں آیا تو قصیدہ لکھ مارا اور دربار میں سرِعام سنا دیا۔ خوشامد پیشہ درباریوں نے خوب داد دی۔ ایک نک چڑھا بڑا شاعر بھی وہاں موجود تھا، اس نے کہا ’’تری تُک بندی‘‘۔ خلیفہ سرِعام اس بے عزتی پر برہم ہوا اور اسے اصطبل بھجوا دیا کہ ہر وقت گھوڑوں کے ساتھ رہے۔ چار پانچ ماہ بعد خلیفہ نے سوچا کہ اب اس کا سافٹ وئر اپ

ڈیٹ ہو گیا ہو گا اس لیے اس نے اس شاعر کو اصطبل سے بلوایا اور دربار میں ایک نیا قصیدہ سنانا شروع کیا۔ ابھی اس نے چند شعر پڑھے تھے کہ شاعر خاموشی سے اٹھ کر چل دیا۔ خلیفہ نے کہا: پورا قصیدہ تو سنو، کہاں جاتے ہو؟ شاعر بولا: اصطبل۔

قارئین کرام! میری مشکل یہ ہے کہ بوڑھا اور بیمار آدمی ہوں اس لیے نہ اصطبل جا سکتا ہوں، نہ غائب ہونا یا چلّا کاٹنا افورڈ کر سکتا ہوں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ نہ مَیں سوال پوچھوں اور نہ اصطبل کی باری آئے۔

غزہ

تاریخ لکھی جائے گی

* تاریخ لکھی جائے گی کہ مصر کے پاس دریائے نیل تھا اور غزہ پیاس سے مر گیا۔

* تاریخ لکھی جائے گی کہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے پاس تیل کے سمندر تھے جبکہ غزہ کے ہسپتالوں اور ایمبولینس کے لیے ایندھن نہیں تھا۔

* تاریخ لکھی جائے گی کہ مسلمانوں کے پاس 50 لاکھ سے زائد فوجی تھے: مصر، ایران، ترکی اور پاکستان کے پاس جنگی جہاز اور میزائل بھی تھے مگر وہ نہ کوئی سپاہی غزہ بھیج سکے اور نہ غزہ میں قتل عام روک سکے۔

* تاریخ لکھی جائے گی کہ سعودی عرب نے اربوں ڈالر ناچ گانے کی پارٹیوں پر لٹا دیے لیکن غزہ میں روٹی پانی نہیں تھا۔

* اور تاریخ لکھی جائے گی کہ 1947 میں پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا لیکن اس نے غزہ میں اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔

* اور تاریخ لکھی جائے گی کہ ترکی نے اسلام کا نام تو بہت استعمال کیا لیکن غزہ کے قتل عام کو روکنے کے لیے ایک قدم بھی نہ اٹھایا جبکہ مسلمانوں کے قتلِ عام میں حصہ بہت ڈالا۔

* تاریخ لکھی جائے گی کہ مسلمان قوم اپنے حکمرانوں کو تو موردالزام ٹھہراتی رہی لیکن پیپسی، کوک، سپرائٹ اور سٹنگ پینا چھوڑ سکی نہ میکڈونلڈ اور کے ایف سی کے برگر کھانا چھوڑ سکی۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر طفیل ہاشمی

علوم اسلامیہ میں تحقیق کی زبوں حالی

غالبا 87-1986ء کی بات ہے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ایم فِل علوم اسلامیہ شروع کرنے کے لیے مَیں نے کچھ سٹڈی گائیڈز لکھیں جن میں اسلام میں تحقیق کے اصول ومبادی، اطلاقِ تحقیق اور تحقیق نگاری مَیں نے خود اور اصولِ تحقیق ڈاکٹر سلطانہ بخش سے لکھوائی تھی۔ عام طور پر جامعات نے ان میں سے تحقیق نگاری پر زیادہ توجہ دی اور پھر بعد میں کئی اہلِ علم نے زیادہ مفصل اور جامع کتب تالیف کیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ تحقیق نگاری ایک ٹیکنیکل کام ہے جو چند ایک ضروری باتیں بتانے سے اور پھر مقالہ نگار تھوڑا سا مشاہدہ استعمال کر کے ہفتے بھر میں اس میں ماہر ہو جاتا ہے۔

ہمارے دور میں علومِ اسلامیہ کی تحقیق میں جو چیز missing ہے وہ مقالہ نگار کا اپنا وجود ہے۔ درحقیقت تحقیق کے لیے جتنا وقت ڈیٹا جمع کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے اس سے کم از کم چار گنا زیادہ وقت اس پر غور و فکر کے لیے چاہیے ہوتا ہے۔ جب تک محقق ان حالات میں، اس ماحول میں، اس سماجی یا سائنسی لیب میں جہاں سے وہ ڈیٹا جمع کر رہا ہے طویل وقت گزار کر ہر پہلو سے تحلیلی تجزیہ نہ کر لے کوئی تحقیق وجود میں نہیں آتی۔ لکھی ہوئی چیزوں کو تحقیق نگاری کے اسلوب پر لکھنا تحقیق نہیں ہے۔ آپ کا ڈیٹا جس عہد، زمانے اور سماج سے تعلق رکھتا ہے اس کی لیب میں ڈال کر اس کی authenticity چیک کریں، پھر تحقیق کے دونوں طریقوں، استقرائی اور استخراجی، سے اس کے فارمولے بنائیں۔ ان فارمولوں کا اپنی پرابلم پر اطلاق کر کے نتائج دیکھیں، پھر ان نتائج کو اپنی موجودہ یا متوقع سوشل لیب میں ڈال کر دیکھیں کہ کیا آپ کی پرابلم حل ہوئی یا نہیں۔

تحقیق ایک رجحان ہے۔ ہر صاحبِ علم محقق نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نظام ہائے تعلیم کی اساس حفظِ جزئیات پر ہے۔ جس کی وجہ سے غیر معمولی حافظے والے طلبہ کو ادارہ اور وہ خود بھی اپنے آپ کو ترجیح دینے لگ جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ اچھے محقق ہو

سکتے ہیں حالانکہ تحقیق کا تعلق تشکیک اور غور وفکر سے ہے۔ اگر کسی میں حافظہ اور تفکیر دونوں جمع ہو جائیں تو نور علی نور ورنہ صرف حافظے کی برتری محقق بننے میں معاون نہیں ہوتی۔

دینی مدارس کے فضلاء کو بالعموم یہ شکایت ہوتی ہے کہ ان کو محقق تسلیم نہیں کیا جاتا اور ان کی تحقیق تحقیقی مجلّات قبول نہیں کرتے۔ میرے خیال میں جہاں اس کی کچھ ناگفتہ بہ وجوہات ہیں وہاں ایک یہ بات بھی ہے کہ دینی تعلیم کا موجودہ اندازِ تدریس طالب علم میں حتمیت پیدا کرتا ہے اور تحقیق میں یہ تاثر پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے کہ ہماری اب تک کی تحقیق کے نتائج یہ ہیں جو حتمی نہیں اور ان پر مزید تحقیق ہو سکتی ہے۔ دینی مدارس کی فقہی وابستگیاں اور افتاء کی تدریس بھی تحقیقی مزاج پیدا کرنے میں رکاوٹ ہے۔

سپروائزر کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ زیرِ تربیت محقق کو اس موضوع کے حوالے سے ریسرچ میتھاڈالوجی بتائے اور ان کتابوں کی طرف رہنمائی کرے جن کے ذریعے محقق مزید مراجع ومصادر سے آگاہ ہو سکے۔ نیز محقق کو کسی دلدل میں پھنسنے یا آخر میں ناکام ہونے کی روش سے محفوظ رکھے۔ بدقسمتی سے کچھ سپروائزر اپنے آپ کو صرف قبلہ سمجھتے ہیں کہ ان کی طرف رخ کرنا صحتِ مقالہ کے لیے فرض ہے اور بس، جب کہ کچھ طلبہ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اچھا سپروائزر وہ ہے جو بٹھا کر مقالہ املا کروا دے اور یہ دونوں رویے غلط ہیں۔

اسلامی تحقیق کے حوالے سے دینی مدارس کے فضلاء کی فہمِ نصوص اور استنباط واستخراج کی صلاحیتیں قابل قدر ہوتی ہیں لیکن عقیدت وجمود تحقیق کی راہ کا سنگِ گراں ہو جاتے ہیں۔ جدید جامعات کے طلبہ عقیدت وجمود سے پاک ہوتے ہیں لیکن تحقیق کے بنیادی Tools سے خالی۔

اگر آپ اعلیٰ پائے کے محقق بننا چاہتے ہیں تو بنیادی علمی صلاحیت حاصل کریں اور فقہی ومسلکی وابستگیوں اور عقیدتوں سے ماورا ہو کر ایک ایسے میدان میں اتر آئیں جہاں آپ کو اختلاف اور مخالفتوں کا قدم قدم پر سامنا ہوگا۔ آپ کی جماعت نہیں بن سکے گی البتہ آپ قوم کے مستقبل کی تعمیر میں شریک ہو سکیں گے اور اللہ کے ہاں ان شاء اللہ سرخ رو ہوں گے۔

علومِ اسلامیہ میں اس نوعیت کے مقالات آ رہے ہیں کہ اگر مقالہ نگار قسم کھائے کہ اس پانچ سو صفحات کی کتاب میں ایک لفظ بھی اس کا اپنا نہیں ہے تو حانث نہیں ہوگا۔

تعلیم و تربیت

سوشل میڈیا کے طلبہ و طالبات پر منفی اثرات

بعض میڈیا رپورٹس کے مطابق سوشل میڈیا کی تصوراتی دنیا سے متاثر ہو کر کم سن لڑکے لڑکیوں کے گھر سے فرار کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ رپورٹ کے مطابق پچھلے چند روز کے دوران لاہور ریلوے سٹیشن پر پولیس کے ہیلپ ڈیسک نے پندرہ بچوں کو محفوظ مقام پر پہنچایا۔ جن بچوں کو ان کے والدین کے حوالے کیا گیا انہوں نے اعتراف کیا کہ گھر سے بھاگنے کی ترغیب انہیں سوشل میڈیا پر مختلف نوع کی ویڈیوز دیکھنے سے ملی۔ سوشل میڈیا سماجی روابط کا ذریعہ ہے، پاکستانی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھیں تو یہ مختلف اجنبی افراد کے درمیان رابطے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس طرح کی ٹیکنالوجی کے مضمرات سے والدین اور اساتذہ واقف ہیں، کسی حد تک بچوں کی نگرانی بھی کی جاتی ہے لیکن بہت سے گھروں میں بچوں کی مسلسل نگرانی سے کوتاہی برتے جانے سے اجنبی افراد معصوم بچوں کا اعتماد حاصل کر کے انہیں گمراہ کر لیتے ہیں۔ آئے دن بچوں کے ساتھ ہونے والے جرائم کی ایک بڑی وجہ سوشل میڈیا کے توسط سے اجنبی افراد کے ساتھ دوستی ہے۔ والدین کو اس معاملے پر سنجیدگی سے دھیان دینے کی ضرورت ہے، بچوں کو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ والدین اور اپنے بھائی بہنوں سے زیادہ ان کا کوئی خیر خواہ نہیں۔ دوسری طرف قانون نافذ کرنے والے اداروں کو سوشل میڈیا پر سرگرم بدقماش افراد کے خلاف موثر کارروائی کرنا چاہیے تا کہ مستقبل کے معماروں کو ایک محفوظ ماحول میں پروان چڑھنے کے مواقع مل سکیں۔

سوشل میڈیا کے منفی اثرات (انیلا نذیر، اسلام آباد)

آج کے جدید دور میں ہمارے پاس معلومات اور پیغامات کا ایک ہجوم ہے جو سیلاب کی طرح ہر جگہ پھیلتا چلا جا رہا ہے محض ایک کلک پر دنیا جہان کی معلومات آپ کے سامنے بکھری پڑی ہوتی ہیں۔ ہم اس ہجوم میں اس قدر الجھ گئے ہیں کہ ہماری اقدار۔ ہمارا علم اور ہماری تخلیقی صلاحیت بالکل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری نوجوان نسل اسی وجہ سے اپنی زندگی کے مقاصد

بھولتی جارہی ہے۔ ایک ہی گھر میں رہنے والے لوگ دوسرے افراد کی خبرنہیں پاتے لیکن سات سمندر پار بیٹھے دوستوں اور واقف کاروں کو پیغامات بھیجتے ضرور نظر آتے ہیں۔ ایک اور غلط رجحان جو ہمارے معاشرے میں نمودار ہورہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پرائیویسی کا احساس ختم ہوتا جارہا ہے یعنی اگر کسی بھی گھر میں کوئی بھی ذاتی تقریب منعقد ہوتو اگلے دن آدھے خاندان کو تصاویر دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ دیگر ممالک میں سوشل نیٹ ورک کی ویب سائنس کو معلومات پھیلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کی تازہ مثال مصر،شام ،لبنان اور ترکی ہیں لیکن پاکستانی معاشرے میں ہم لوگ تفریح اور خودنمائی سے باہر ہی نہیں نکل سکے تو اس کا مثبت استعمال جانے کب سیکھیں گے؟ کسی بھی مثبت صورتحال کے اثرات دور دور تک نظر نہیں آتے۔ ہم بنیادی طور پر شغل میلے میں مصروف قوم اور غیر سنجیدہ رویے کے حامل لوگ ہیں۔ سوشل نیٹ ورکنگ نے بھی ہمیں آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا ہے۔

سوشل میڈیا کا لفظ جب سماعت میں پڑتا ہے تو پہلی چیز جو ہمارے ذہن کے پردوں پر ابھرتی ہے وہ ہے "فیس بک" ویسے تو میڈیا کی بہت سی ویب سائٹس ہیں مگر "فیس بُک" سب سے مقبول ترین سائٹ ہے۔ سوشل میڈیا نے انٹرنیٹ اور WIFI جیسی جدید ٹیکنالوجی کے آنے کے بعد بہت تیزی سے مقبولیت حاصل کر کے اپنی جگہ بنائی ہے۔ سوشل میڈیا نے جہاں اتنی ترقی کی وہاں اس نے ہماری نوجوان نسل پر بہت سے غلط اثرات بھی مرتب کیے ہیں۔ جدید سائنس نے ہمارے لیے جہاں بے شمار آسانیاں پیدا کی ہیں وہیں بہت سی مشکلات کو بھی جنم دیا ہے۔ جہاں کمپیوٹر کی ایجاد نے دنیا میں ایک نیا انقلاب برپا کردیا ہے اور دوسری طرف اس سے انٹرنیٹ کی وابستگی نے تو دنیا جہاں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ سوشل میڈیا کے فوائد کے ساتھ برائیوں اور نقصانات کی بھی ایک لمبی فہرست موجود ہے۔ زیادہ تر نوجوان نسل اپنا قیمتی وقت سوشل نیٹ ورکنگ پر ضائع کردیتی ہے اسی کی وجہ سے نوجوان نسل اپنی پڑھائی پر صحیح طریقے سے توجہ نہیں دے سکتی اور اپنا قیمتی وقت ضائع کردیتی ہے اس کے علاوہ سوشل نیٹ ورکس کے ذریعے تحقیق سے پہلے ہی خبر پوری دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ جعلی اکاونٹس کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہے بے حیائی کا کھلے عام اظہار، بے معنی اور ناشائستہ زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بہت سے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی ہیں اس لئے ہمیں اپنے آپ کو

ایسے لوگوں سے بچا کر رکھنا ضروری ہے جو سوشل میڈیا پر فساد، بدامنی، لڑائی جھگڑے، بے حیائی اور غلط خبریں پھیلاتے ہیں۔ کوئی بھی بات بغیر تحقیق کے شیئر نہ کریں۔ ہمیشہ سماجی ویب سائٹس پر اچھی اور حق وصداقت پر مبنی خبریں شیئر کریں جو آپ کے لئے صدقہ جاریہ بھی ہیں اور حکومت کو چاہیے کہ سوشل میڈیا پر جعلی اکاؤنٹس رکھنے والوں کو کڑی سزا دے۔

سوشل میڈیا اور نوجوان نسل (زین قریشی)

حالیہ برسوں میں سائبر کرائم کی شرح میں بے حد اضافہ دیکھا گیا ہے۔ کورونا وائرس نے جہاں پوری دنیا کو کورنٹین، لاک ڈاؤن اور قوتِ مدافعت جیسی نئی اصلاحات سے روشناس کروایا وہیں پر انٹرنیٹ کے ذریعے زندگی گزارنے کا ایک نیا تجربہ بھی دیا۔ دفاتر سے لے کر سکول تک روزمرہ کے معاملات چلانے کے لیے ہر کوئی انٹرنیٹ کا محتاج رہا۔ یہاں تک کہ کورونا کے دوران لوگوں کے لیے کاروبار کرنے کا واحد طریقہ بھی انٹرنیٹ ہی ممکن ہوا۔ پہلی دفعہ عدالتوں میں بھی ویڈیو لنک کے ذریعے عدالتی کاروائی چلانے کی بات سننے کو ملی۔ جب بھی کسی چیز کا استعمال بڑھتا ہے تو اس کے ممکنہ اچھے اور برے اثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ طالب علموں اور خصوصاً کم عمر بچوں میں انٹرنیٹ اور موبائل فون کا استعمال اس قدر بڑھ چکا ہے کہ بہت سے بچے اس کے منفی اثرات کی لپیٹ میں بھی آ چکے ہیں۔ ان منفی اثرات کی بنیادی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ آج تک سائبر کرائم اور موبائل فون کا صحیح استعمال کرنے کے حوالے سے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کی نوجوان نسل سائبر کرائم کے حوالے سے آگاہی ہی نہیں رکھتی۔

ہمارے کھیل کے میدان خالی ہو چکے ہیں اور نوجوان طبقہ اپنے فارغ اوقات میں بھی موبائل فون پر ویڈیو گیمز کو ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے کم عمر بچوں میں غور وفکر اور اچھے انداز گفتگو کی کمی پائی جاتی ہے۔ سیلفی کے شوقین نوجوان اپنی جانوں کے ساتھ کھیل جاتے ہیں۔ صرف چند ہزار لائک اور مشہور ہونے کے شوق میں اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر لگنے والا بہت سارا مواد ایسا بھی ہوتا ہے جس میں شر پسندانہ مواد پایا جاتا ہے جو نہ صرف کم عمر بچوں کے اندر شدت پسندی کو فروغ دیتا ہے بلکہ ان میں عدم

برداشت بھی پیدا کرتا ہے۔ ہر وقت انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے استعمال اور دوسروں کی زندگیوں میں آنے والی خوشیاں اور غم کے لمحات دیکھ کر بہت سے لوگ ذہنی مسائل کا شکار بھی ہو چکے ہیں۔ یہ بات ہمارے روزمرہ مشاہدہ میں آرہی ہے کہ اکثر اوقات سوشل میڈیا پر لگنے والا مواد نہ صرف قابلِ اعتراض بلکہ ناقابلِ بھروسہ بھی ہوتا ہے۔جس سے معاشرہ میں بے چینی اور بداطمینانی ،غیر ضروری مقابلہ بازی،حسد اور رقابت کے منفی جذبات پروان چڑھتے ہیں، جو سوسائٹی کی اخلاقی روایات کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔بہت سا مواد سوشل میڈیا پر بغیر سوچے سمجھے لگایا جاتا ہے۔ہماری نوجوان نسل کے لئے سوشل میڈیا کا کارآمد اور مثبت استعمال بہت مفید ہوسکتا ہے بشرطیکہ نئی نسل کو سوشل میڈیا کی اخلاقی حدود وقیود اور سائبر لاء کی اہمیت سے بروقت اور متواتر آگاہ رکھا جائے۔

سوشل میڈیا پر لگنے والی اکثر خبریں جھوٹ پر مبنی ہوتی ہیں جس میں لوگوں پر الزامات لگا کر ان کی شہرت کو خراب کیا جاتا ہے اور ایک خبر اچانک لاکھوں لوگوں میں چلی جاتی ہے۔بہت سے لوگ ایسی خبروں سے متاثر ہوئے اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو شہرت کی بلندیوں پر تھے لیکن ایک سوشل میڈیا کی خبر نے نہ صرف ان کی شہرت کو نقصان پہنچایا بلکہ ان کو مالی طور پر بھی شدید مشکلات دیکھنا پڑی۔ بہت سے لوگوں کو سوشل میڈیا پر لگنے والی خبروں کے بعد ان کی نوکریوں سے فارغ کردیا گیا۔ بہت سے لوگوں کے کاروبار سوشل میڈیا پر لگنے والی خبر کی وجہ سے متاثر ہوتے ہیں۔ بہت سے ہنستے بستے گھر سوشل میڈیا کی بھینٹ چڑھ گئے۔ بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں ناسمجھی اور بھول پن میں اپنا مستقبل خراب کر بیٹھتے ہیں اور پھر سوائے پچھتاوا اور پیشمانی کے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔سوشل میڈیا پہ لگنے والی خبر دس سال بعد بھی زندہ رہتی ہے اور لوگ اس پر یقین بھی کرتے ہیں۔قابل اعتراض تصویریں بنانے سے بھی اجتناب کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ پھرانہی تصویروں کو استعمال کر کے لوگوں کو بلیک میل کیا جاتا ہے۔بہت سے لوگ قابلِ اعتراض تصویریں اعتماد میں آکر کسی کی محبت کے جھانسے میں آکے بھیج تو دیتے ہیں لیکن پھر ساری زندگی بلیک میل ہوتے ہیں۔

اس بات میں بھی حقیقت ہے کہ جہاں سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے منفی اثرات موجود ہیں وہاں بہت سے لوگ اس سے شہرت حاصل کر کے راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ

گئے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے ذریعے کاروبار شروع کیے اور دوسرے لوگوں کو بھی روزگار فراہم کیے۔ سوشل میڈیا معلومات تک رسائی کا بھی آسان ذریعہ بنا۔ آج دنیا بھر کی خبریں آسانی سے لوگوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ سوشل میڈیا کا استعمال ہماری زندگیوں میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے یہاں تک کہ روزمرہ کے دفتری کاموں کو چلانے کے لیے اب اس کی بے حد ضرورت ہے۔

اب وقت آچکا ہے کہ تعلیمی اداروں میں سوشل میڈیا، موبائل فون اور سائبر کرائم سے آگاہی کے حوالے سے عملی اقدامات کیے جائیں۔ سائبر قوانین کی آگاہی بھی بہت ضروری ہے سائبر کرائم اور ان کی روک تھام سے متعلق جیسے ضروری موضوع دسویں جماعت تک کے طالب علم کو پڑھانے بہت ضروری ہو چکے ہیں۔ نوجوان نسل کو انٹرنیٹ سے دور کرنا فائدہ مند نہ ہوگا بلکہ اس کا اصل استعمال اور اثرات بتانا سوسائٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ نوجوان نسل کو یہ بتانا انتہائی اہم ہے کہ سائبر قوانین کون کون سے ہیں اور سائبر کرائم سے بچنے کی احتیاطی تدابیر بتانا بھی انتہائی ضروری ہے۔

بقیہ: وحدانی نظام تعلیم

۶۔ اسلامیات کی تعلیم کا معیار بلند کیا جائے یعنی اسلامیات کے نصاب میں ہر مرحلہ پر اتنی تعلیم دی جائے جو بچے کو ہر عمر میں اسلامی ضابطۂ حیات کے عین مطابق زندگی گزارنے کی طرف مکمل رہنمائی کرتی ہو نیز سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تاریخِ اسلام، اقبالیات کو اسلامیات کے طلبہ کے نصاب کا باضابطہ حصہ بنایا جائے۔

۷۔ ذریعۂ تعلیم ملک بھر کے تمام تعلیمی اداروں (بشمول دینی مدارس) میں اردو کو بنایا جائے تاکہ قومی زبان کے ذریعے علم وفن میں مکمل مہارت حاصل ہو سکے۔

۸۔ خواتین کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق الگ نصاب مرتب کیا جائے اسلامی تصورِ تعلیم کے مطابق عورت کا فریضہ چونکہ کسبِ معاش نہیں بلکہ نسلِ نو کی بنیادی تربیت ہے اس لیے ان کے فریضۂ زندگی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نصاب مرتب کیا جائے۔

۹۔ تعلیمِ بالغاں کا معیاری، مختصر اور جامع نصاب مرتب کیا جائے۔

تعلیم و تربیت

حافظ عتیق الرحمٰن گورچانی{۱}

وحدانی نظام تعلیم

مفہوم

بعثت کی اولین گھڑی میں ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی یعنی سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات، ان میں ملت اسلامیہ کو تاابد ایک روڈ میپ فراہم کر دیا گیا کہ تمہاری بقاء علم و معرفت کے حاصل کرنے میں مضمر ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں نے اپنے ہزار سالہ دورِ عروج میں علوم و فنون کو غیر معمولی اہمیت دی۔ مرورِ زمانہ اور مسلمانوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے اقتدار کی زمام سے مسلمانوں کو ہاتھ دھونا پڑا جس کی بدولت مسلمان حاکم سے محکوم اور غالب سے مغلوب ہو کر اپنی ہمہ جہت آزادی کھو بیٹھے۔ ایسے میں بعض اصحابِ عزیمت نے پیش قدمی کر کے مسلمانوں کے دینی نظامِ تعلیم و تربیت کو محفوظ بنانے کی کوشش کی۔ تاہم برطانوی استعمار کے غلبہ کے وقت اٹھائے جانے والے اس قدم کو مسلمانوں نے اب تک مقدس سمجھ کر اور عصر حاضر کے تقاضوں سے منہ چھپا کر اختیار کر رکھا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ مسلمانوں کو ماضی کے مثالی و جامع نظام تعلیم کی جانب اس انداز سے ملتفت کیا جائے کہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کا بھی برابر لحاظ و پاس موجود ہو تاکہ مسلمان آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کے ساتھ دنیا کی بھلائیوں سے بھی متمتع ہو سکیں۔ ذیل میں اسی فکر کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

پسِ منظر

موجودہ حالات میں مسلم امہ جن دردناک حالات سے دوچار ہے ہر صاحبِ دانش اس سے بخوبی آگاہ ہے۔ یقیناً انسانیت دشمن عناصر اس امت پر حدیث مبارک کے مصداق ''بھوکے بھیڑیوں کا کھانے پر پل پڑنے کی مانند'' حملہ آور ہیں۔ امت مسلمہ جہاں ظاہری و خارجی جہتوں سے برپا کیے جانے والے معرکوں کا شکار ہے وہیں اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان تابڑتوڑ حملوں کے جواب دینے کے لیے جس جوانمردی، جذبے، ایمانی تڑپ، منصوبہ بندی، لائحہ عمل اور حکمتِ عملی کی ضرورت ہوا کرتی ہے (جو اس

{۱} ایم فل (علوم اسلامیہ) وفاقی اردو یونیورسٹی و مدیر جامعہ اصحاب صفہ، ڈیرہ غازی خان

امت کا ماضی میں طرۂ امتیاز رہا ہے) موجودہ حالات میں اس کا عشر عشیر بھی دیکھنے کو نہیں مل رہا۔ یقیناً جب بھی کسی گروہ میں اپنے دشمن کے حملوں سے دفاع کی قوت معدوم ہوتی ہے تو اس کا بنیادی سبب اس کی باطنی واندرونی کمزوری ہوا کرتی ہے۔ ہمارے خیال میں مسلم معاشرہ اس وقت اسی قسم کی داخلی کمزوریوں کا شکار ہونے کی وجہ سے معرکۂ خیر وشر میں سینہ سپر فوج کا کردار ادا نہیں کر رہا۔

ہمارے جائزے کے مطابق موجودہ معرکہ آرائی میں فکری وتہذیبی لحاظ سے مسلم معاشرے کو جن مسائل کا سامنا ہے اگر انہیں عنوان دے کر تقسیم کیا جائے تو ان کی یہ صورتیں بنتی ہیں:

۱۔ مسلم معاشرے کا بالعموم اور نوجوانوں کا بالخصوص اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہو جانا جبکہ اسلامی معاشرے اور تہذیب کی بنیاد ہی اخلاقیات پر ہے۔

۲۔ اسلامی معاشرے کو اس کے تہذیبی تشخص سے غیر محسوس فکری حملوں کے ذریعے دور کرنا۔

۳۔ مسلمان نوجوانوں کا فکری رخ تعلیم کی حقیقی روح یعنی معرفتِ حق اور اجتماعی مفاد سے پھیر کر محض محدود وذاتی مفادات اور مادیت پرستی کی نذر کر دینا۔

فکری حملوں کا دفاع

دیانت داری سے تجزیہ کیا جائے تو دشمن کی جانب سے جاری ان فکری حملوں میں کامیابی کا اصل سبب مسلم معاشرے میں نسلِ نو کی تربیت سے انتہا درجہ کی غفلت ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہر بچے کی انفرادی تربیت کے حوالے سے پہلی تربیت گاہ اس کے والدین جبکہ دوسری تربیت گاہ اس کا تعلیمی ادارہ ہے۔ اور اگر تربیت کے ان ہر دو مراکز سے تربیت ناقص ہو رہی ہو تو پھر معاشرے میں دو اہم جہتیں ہیں جو اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایک جہت مذہبی پیشوا یا رہبر کی ہے اور دوسری جہت ذرائع ابلاغ کی ہے۔ تربیت کے اولیں مراکز سے ناقص تربیت کے باوجود اگر ان دونوں جہتوں سے پیغام درست آ رہا ہو تو پھر بھی نوجوان درست سمت گامزن ہو جاتا ہے اور اگر ان دونوں جہتوں سے پیغام درست نہ آ رہا ہو تو والدین و تعلیمی ادارے کی تربیت میں نقص کی بنا پر نوجوان مذکورہ بالا ان تینوں حملوں کا شکار ہو جاتا ہے، کیونکہ دشمن کے

غیر محسوس تہذیبی وفکری حملوں کا بالواسطہ ذریعہ مذہبی رہبر اور ذرائع ابلاغ کی مجموعی کیفیت وہی ہے جس کی جانب ہم نے اشارہ کیا ہے۔ حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان طبقات میں کہیں انفرادی سطح پر بھی خیر اور احساس کے جذبات موجود نہیں۔

تعلیمی ادارے کا کردار

اب جبکہ حالات کا رخ یہ ہے کہ والدین نسلِ نو کی تربیت سے غافل ہیں یا ان پر بھی مذہبی رہبر اور ذرائع ابلاغ کی جہت سے آنے والا پیغام غالب ہے تو واحد آماجگاہ جہاں سے نسلِ نو کی انفرادی واجتماعی تربیت کی امید امکانی صورت میں موجود ہے وہ تعلیمی ادارے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے نسلِ نو کی تربیت کے اس اہم میدان میں بھی وہ نظام ونصاب مسلط کر دیا گیا ہے جو بالواسطہ دشمن کے تہذیبی وفکری حملوں کا معاون ومددگار ہے۔ صرف نظام ونصاب تعلیم کی خرابی کی بنا پر تعلیمی ادارے نسلِ نو کی تربیت کے میدان میں ناکام نظر آتے ہیں اور حد درجہ افسوس وحیرت اس بات پر ہے کہ تعلیمی اداروں کی اس حالتِ زار اور اس کے ذمہ دار نظام ونصاب کے نقائص کو جاننے والے ان کے سیاہ وسفید کے مالک بظاہر بے بس نظر آتے ہیں حالانکہ اگر اجتماعی مفاد کو ملحوظِ خاطر رکھنے کی حِس بیدار ہو تو ایسا کسی صورت ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز کو غلط اور ناقص کہہ کر بھی اپنی تجوری میں اسے جگہ فراہم کی جا رہی ہو۔

اسلام کا تصورِ تعلیم

ہمارے جائزے کے مطابق اس صورتِ حال کا بنیادی سبب اسلامی تصورِ تعلیم سے یا تو چشم پوشی ہے یا ناآشنائی۔ کسی زمانے اور جغرافیہ کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر اگر ہنگامی بنیادوں پر کچھ آزمائشی اقدامات عمل میں لائے گئے تھے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ زمانہ جتنا بدل جائے۔ حالات خواہ کتنے ہی معمول پر نہ آجائیں ان ہنگامی اقدامات سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا۔ اسلامی تصورِ تعلیم کے مطابق علوم وفنون میں کسی قسم کی دوئی نہیں ہے۔ اسلام تو قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہر زمانے کے حالات کے مطابق ایک کامل ضابطۂ حیات کا نام ہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ زمانہ کے کروٹ لینے کے ساتھ زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر اگر نت نئے علوم وفنون وجود میں آئیں تو اسلامی تصورِ تعلیم انہیں مادی علوم کہہ کر دھتکار دے۔

وحدانی نظام تعلیم

اسلامی تصور تعلیم تو یہی ہے کہ شریعت اسلامیہ یا اسلامی ضابطہ حیات کی مکمل معرفت کے دائرے میں رہ کر زمانے اور حالات کی ضرورتوں کے تحت جنم لینے والے جدید علوم وفنون کے بنیادی فلسفے کو اس طرح اسلامیت یا اسلامی نظریات میں ڈھال دیا جائے کہ عصری تقاضوں کے پیش نظر وجود میں آنے والے علوم وفنون، دینِ فطرت یعنی اسلام کے اس طرح عین مطابق نظر آئیں کہ جیسے ایک جیسی دو چیزوں میں موافقت ومطابقت ہوا کرتی ہے۔ اسلام کے اسی تصورِ تعلیم کو وحدانی نظام تعلیم کہا جاتا ہے جو دیگر اسلامی نظریات کی طرح اسلامی معاشرے سے معدوم ہوتا جارہا ہے۔

وحدانی نظامِ تعلیم کو اگر آج اختیار کیا جائے تو اس کی شکل کیا ہوگی؟ ہم برصغیر کے نامور اور مستند مفکرین کی آراء میں ضروری ترامیم کے ساتھ اس کا مجوزہ نقشہ پیش کرتے ہیں:

تجاویز

١۔ پاکستان بھر میں سرکاری ونیم سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں نظام، تعلیمی مزاج، معیار تعلیم کے اعتبار سے یکسانیت کا نفاذ عمل میں لایا جائے یعنی یکساں نظام تعلیم کا نفاذ کیا جائے۔

٢۔ تمام صوبہ جات میں موجودہ سرکاری سکولز، کالجز پر کام کرنے والے تعلیمی بورڈ کے نظام کو یکساں کیا جائے اور ان تمام بورڈز میں بھرپور یکسانیت پیدا کرنے کے لیے انہیں ایک وفاقی تعلیمی بورڈ کے ماتحت کر دیا جائے۔

٣۔ پرائیویٹ سکولز وکالجز کے سلسلے میں دو قسم کے اقدامات عمل میں لائے جائیں:

* محض کاروباری مزاج کے، تعلیمی معیار سے گرے ہوئے تعلیمی اداروں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اچھے تعلیمی معیار کے حامل پرائیویٹ سکولز وکالجز کے لیے ایک الگ سے پرائیویٹ بورڈ تشکیل دیا جائے جو ان تعلیمی اداروں میں نظام، تعلیمی مزاج، اور معیارِ تعلیم کے اعتبار سے یکساں نظامِ تعلیم کا نفاذ عمل میں لاسکے۔ یہ بورڈ بھی بلاواسطہ وفاقی تعلیمی بورڈ کے

ماتحت ہو۔

۴۔ پرائیویٹ سطح پر کام کرنے والے مذہبی مدارس کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل اقدامات کیے جائیں:

* مدارس کے تمام وفاقوں کو، جو ایک بورڈ کے طور پر کام کر رہے ہیں، انہیں برقرار رکھا جائے لیکن ان میں نظام، تعلیمی مزاج اور معیار تعلیم کی یکسانیت پیدا کرنے کے لیے ان پر ایک مدرسہ ایجوکیشن بورڈ قائم کیا جائے جو بلا واسطہ طور پر وفاقی تعلیمی بورڈ کے ماتحت ہو۔

* مدارس دینیہ کے نظامِ تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جس کی ترتیب حسبِ ذیل ہے:

i۔ پہلے حصہ تعلیم میں انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم کو مدارس میں لازمی قرار دیا جائے اور اس تعلیمی دورانیے میں مدارس کے نظام میں اور تمام تعلیمی اداروں کے نظام میں یکسانیت پیدا کر دی جائے تاکہ اس تعلیمی دورانیے سے تعلق رکھنے والا بچہ اگر کسی دوسرے ادارے سے چھوڑ کر کسی بھی کلاس میں داخلہ لینا چاہے تو مدارس میں اس کے لیے جگہ موجود ہو۔

ii۔ دوسرے حصہ تعلیم میں ۸ سالہ درس نظامی کورس کو بڑھا کر ۱۰ سالہ کر دیا جائے جس کی ترتیب درج ذیل ہو:

* اس دورانیے میں اسلامیات و عربی میں پی ایچ ڈی سطح تک تعلیم دی جائے۔

* انٹرمیڈیٹ کے بعد ۲ سال بیچلر، اور ۲ سال ماسٹر سطح کا تعلیمی دورانیہ مرتب کیا جائے جس میں تمام اسلامی علوم کو جنرل اور عمومی سطح پر پڑھایا جائے۔

* مزید ۶ سال میں سے، ۳ سال ایم فل اور ۳ سال پی ایچ ڈی سطح کا تعلیمی دورانیہ مرتب کیا جائے جس میں بچے کی رغبت اور صلاحیت کو جانچ کر مختلف علوم وفنون میں الگ الگ تخصص کروایا جائے تاکہ کسی ایک فن کے باضابطہ ماہر تیار ہو سکیں۔

* مدارس دینیہ کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے تمام جامعات سے اسلامیات و عربی کی فیکلٹیز کو ختم کر دیا جائے اور ان کو مدارس دینیہ کے ساتھ خاص کر دیا جائے۔

۳۔ سرکاری سطح پر انٹرمیڈیٹ کے بعد تخصص (Specialization) پر مبنی نظام

تعلیم مرتب کیا جائے جس کی ترتیب درج ذیل ہونی چاہیے:

* بیچلر اور ماسٹر کے ۴ سالہ نظامِ تعلیم میں آپس میں فنی قربت رکھنے والے شعبہ جات یا علوم وفنون کو یکجا کر کے پڑھایا جائے یعنی ایک ہی مزاج کے علوم وفنون کی جنرل، عمومی اور بنیادی تعلیم دی جائے۔

* ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تعلیمی دورانیے میں ایک مزاج کے علوم وفنون کی ذیلی برانچز میں طالب علم کی رغبت وصلاحیت کو جانچ کر الگ الگ تخصص کروایا جائے تا کہ ہر فن کے باضابطہ ماہر تیار ہوسکیں۔

۴۔ ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں بچے کی تعلیمی منصوبہ بندی (Career Counciling) کو لازمی طور پر رواج دیا جائے۔ جس کی ترتیب درج ذیل ہونی چاہیے:

* پرائمری، مڈل، میٹرک اور انٹرمیڈیٹ تک کے تمام مراحل کے اختتام پر امتحان کے ساتھ تحریری وتقریری ہر دو طریقہ سے جائزہ ٹیسٹ کا انعقاد عمل میں لایا جائے جس میں یہ جانچا جائے کہ بچے کی رغبت کن علوم وفنون کی طرف کتنی ہے؟

* کلاس کی سطح پر ہر مضمون کے استاد کو ایک گوشوارہ دیا جائے تا کہ وہ ماہانہ اس میں درج کرے کہ کس بچے کی رغبت اس کے پڑھائے جانے والے مضمون میں کتنی ہے؟

* پرائمری، مڈل، میٹرک اور انٹرمیڈیٹ تک کے تمام مراحل کے اختتام پر ہونے والے جائزہ ٹیسٹ اور کلاس میں تمام مضامین کے اساتذہ کی جانب سے پُر کیے جانے والے گوشواروں کی روشنی میں بچے کی تعلیمی رغبت پر مبنی ایک سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے اور انٹرمیڈیٹ کے بعد کے تعلیمی مراحل میں ان سرٹیفکیٹس کی بنیاد پر یونیورسٹیاں، طالب علم کو متعلقہ شعبہ میں داخلہ دیں۔

* بیچلر سے پی ایچ ڈی تک بھی ہر مرحلے پر طالب علم کے متعلقہ فن یا شعبے کی مختلف برانچوں میں اس کی رغبت کا جائزہ اس ترتیب سے لیا جاتا رہے تا کہ کسی بھی سطح پر طالب علم کوئی غلط فیصلہ نہ کرنے پائے۔

* بیچلر سے پی ایچ ڈی تک کے تعلیمی دورانیے میں ہر مرحلے کے بعد عملی میدان میں

کام کرنے کے حوالے سے مختلف اداروں میں طلبہ کی رغبت کی جانچ پڑتال کو بھی جائزہ ٹیسٹوں کا حصہ بنایا جائے اور اسی بنیاد پر اس کو رغبت سرٹیفکیٹ بھی جاری کیا جائے تاکہ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ اپنے مطلوبہ ادارے میں عملی خدمات بہتر طور پر سرانجام دے سکے۔

۵۔ مخلوط نظام تعلیم کا خاتمہ کیا جائے۔

۶۔ تعلیم بالغاں کا بھرپور انتظام کیا جائے۔

۷۔ مشنری تعلیمی اداروں کو غیر مسلموں کے ساتھ خاص کر دیا جائے تاکہ مسلمان بچے کسی بھی طور پر غیر مسلم تہذیب وافکار کا شکار نہ ہوں۔

نصابِ تعلیم

۱۔ نصابِ تعلیم اس طرز پر بنایا جائے کہ اس میں ہر مقام پر اس بات کو بھرپور اجاگر کیا جائے کہ حصولِ تعلیم کا مقصد محض حصولِ معاش ہرگز نہ ہو بلکہ حصولِ تعلیم کا حقیقی مقصد معرفتِ حق، اعلیٰ انسانی اوصاف کا حصول، ملک وملت کی خدمت اور ذات کی تکمیل ہو۔

۲۔ نصابِ تعلیم کو از سرِ نو اس طرح مرتب کیا جائے کہ ہر شعبۂ تعلیم کا نصاب اسلامی سانچے میں مکمل ڈھلا ہوا نظر آئے یعنی اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے افکار ہر علم وفن میں مکمل طور پر واضح نظر آئیں اور متعلقہ شعبہ میں اس انداز سے طالب علم کی مکمل رہنمائی ہو کہ وہ بآسانی جان لے کہ اس شعبہ میں اسلامی تعلیمات وافکار کیا ہیں؟ یعنی اسلام کی آفاقیت کو نظریاتی طور پر نصابِ تعلیم میں غالب کیا جائے تاکہ طالب علم سمجھ سکے کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے۔

۳۔ اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں کو بحیثیت زبان پڑھنے، لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے نصاب میں لازمی طور پر شامل کیا جائے۔

۴۔ کمپیوٹر کی مکمل اور پیشہ وارانہ تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔

۵۔ خیر امت ہونے کی وجہ سے ملت کے ہر فرد کے کاندھوں پر دنیا بھر کے لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچانے کی بھاری ذمہ داری موجود ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کو ابلاغ کے ہر دو شعبوں فن صحافت وخطابت سے روشناس کرایا جائے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۲)

فکر و دانش

حافظ محمد عمران طحاوی

عصرِ حاضر میں احیائے اسلام

روداد سیمینار اسلام آباد

منعقدہ ۱۷/ دسمبر ۲۰۲۳ء

مسلم امت کے زوال اور مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کے علمبردار ممالک کے عالمِ اسلام پر تسلط اور اسلامی خلافت کے خاتمے پر ایک صدی گزر جانے کے باوجود مسلمانوں اور ان کے حکام اور اہل دانش میں وہ بیداری نظر نہیں آتی جو مطلوب تھی۔ علماء کرام اور دینی عناصر نے اس ضمن میں کوششیں ضرور کی ہیں اور انہی پر عالم اسلام کے مستقبل کا انحصار نظر آتا ہے۔ ان کاوشوں نے بلاشبہ بہت سے مثبت اثرات پیدا کیے لیکن ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ابھی کرنے کو بہت کام باقی ہے۔ یہ ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ اختیار کردہ مناہج اور حکمت عملی پر نظر ثانی کی جائے اور ان پر بارِ دگر غور کیا جائے تاکہ مؤثر کام کے نئے راستے دریافت کیے جاسکیں۔

ان موضوعات پر غور کے لیے 'مجلسِ فکر و نظر' کے کنوینر پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب (مدیر البرہان) نے ۵ نومبر ۲۰۲۳ء کو ایک سیمینار/علمی مذاکرہ لاہور فلیٹیز ہوٹل میں رکھا جس میں لاہور کے اہل فکر و دانش نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سیمینار کو فکری بیداری کے حوالے سے مفید پایا تو دوسرے شہروں میں بھی اس طرح کے سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ۱۷/ دسمبر ۲۰۲۳ء کو اسلام آباد E-11/2 میں قرطبہ اسلامک سنٹر میں ایک سیمینار منعقد ہوا جس سے اسلام آباد کے سینئر اسلامی سکالرز اور علماء کرام نے خطاب کیا۔ اس سیمینار کی روداد قارئینِ البرہان اور دوسرے اہل نظر کے لیے ہم یہاں دے رہے ہیں۔ اس سیمینار میں دو خطابات ہمیں خصوصی اہمیت کے محسوس ہوئے۔ ان میں سے ایک مدثر رشید صاحب (صدر دی ریوائیول فاؤنڈیشن) کا مضمون تازہ البرہان میں دیا جا رہا ہے جبکہ ڈاکٹر اسعد زمان صاحب (سابق وائس چانسلر PIDE) کا خطاب ان شاء اللہ اگلے ماہ شائع کیا جائے گا۔

ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر صاحب نے خطبۂ استقبالیہ میں موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ خلافت کے خاتمہ کو ایک صدی گزر چکی ہے لہٰذا امت کے اہل فکر ودانش کو سوچنا چاہیے کہ امت درپیش چیلنجز سے نمٹنے میں کس حد تک کامیاب رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ امت کو درپیش چیلنجز میں سے دو اساسی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک زوال سے نکلنا اور دوسرے اسلام اور مسلم دشمن مغرب کی سازشوں کا مقابلہ کرنا۔ مغرب زدہ حکمرانوں اور اہلِ دانش سے قطع نظر دینی قوتوں نے بلاشبہ ان دونوں پہلوؤں سے جدوجہد کی ہے جس کے مثبت نتائج بھی مسلم معاشرے میں موجود ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بہت کچھ ہونا ابھی باقی ہے۔

تحقیق کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری رائے یہ ہے کہ دینی قوتوں کے موجودہ مناہج کے ذریعے مطلوب تبدیلی اگر پچھلی ایک صدی میں نہیں آسکی تو اب بھی اس کا امکان نہیں لہٰذا دینی قوتوں کے مناہج پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا میں نے اپنی کتاب ''پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟'' کے آخری باب میں مجوزہ اصلاحی کاموں کی تفصیلات بیان کردی ہیں اور اس سیمینار کے ''تعارفی مضمون'' میں بھی ان کی طرف اشارہ کردیا ہے۔ تاہم ان کی تفصیلات میں جانے کی بجائے مَیں مناسب سمجھتا ہوں کہ آج دیگر اہل علم کو سنا جائے کہ وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

ڈاکٹر اسعد زمان (سابق وائس چانسلر PIDE اسلام آباد)

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ مغرب کے غلبے کی بنیادی وجہ علم میں اس کی برتری ہے اور ہمارے زوال کا بنیادی سبب علم وفکر میں ہماری پس ماندگی ہے۔ حالانکہ ہمارے پاس اللہ کا دیا ہوا علم ہے جو انسانوں کے وضع کیے گئے علوم سے بہرطور برتر واعلیٰ ہے اور وہ آج بھی قابل عمل ہے لیکن ہمارے حکمرانوں اور اہلِ دانش کی مغرب کی فکری غلامی کی وجہ سے اپنے اس دعوے پر نہ ہمیں خود یقین ہے اور نہ اس دعوی کو ہم دنیا کے سامنے پیش کرنے کے اہل ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سارے علوم خصوصاً سوشل سائنسز (اکنامکس، نفسیات، فلسفہ، تعلیم، سیاسیات وغیرہ) کی اسلامی تناظر میں تشکیلِ نو کریں اور ان میں مغربی اہلِ علم کو

پچھاڑیں۔ اس طرح علم میں برتری کی بنیاد پر ہم مغرب سے آگے نکل سکتے ہیں جس طرح ہم ماضی میں ان سے آگے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا پورا متن، ان شاء اللہ، اگلے ماہ کے البرہان میں شائع ہوگا۔

مدثر رشید (صدر ریوائیول فاؤنڈیشن)

آج دنیا میں جمہوریت کو بطور نظمِ مملکت اختیار کیا جاتا ہے مگر بغور دیکھا جائے تو جہاں جمہوریت ہوگی وہاں پر اخلاقیات نہیں ہوں گی۔ اکثریت کو فیصلہ سازی کا حق دینا ہی غلط ہے کیونکہ اکثریت نادان ہوتی ہے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو اکثریت کو دھوکہ دینا جانتا ہے وہ کامیاب ہوجائے گا۔ اسی وجہ سے ایک صالح قیادت اوپر نہیں آسکتی کیونکہ دھوکہ دینا اس کی سرشت میں شامل نہیں ہوتا۔ ہماری اسلامی تحریکوں نے اس مسئلے کا حل نہیں سوچا اس لیے ناکام ہوئیں۔ ہماری اسلامی تحریکیں ہمہ گیر منصوبہ سازی کریں، یکسو ہوکر، مغرب سے مغلوب ہوئے، بغیر اسلام کے غلبہ کے لیے جہاں جہاں اتحاد ممکن ہوسکے کریں تاکہ اعلائے کلمۃ الحق ممکن ہوسکے۔ دین ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے لہٰذا ہمہ گیر سوچ ناگزیر ہے۔ تبدیلی نیچے سے آئے گی، مَیں اس کو مانتا ہوں مگر تبدیلی اوپر سے بھی آتی ہے۔ اس امکان کو بھی قبول کرنے کی ضرورت ہے۔ مدثر رشید صاحب کا تفصیلی مضمون الگ سے البرہان میں موجود ہے۔

ڈاکٹر خالد مسعود (سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل)

ہم نے اسلامی روایت کا تسلسل توڑ دیا ہے۔ اسلام کی روایت علمی تھی، جہادی بہت بعد میں بنی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کا جہاد امویوں اور عباسیوں کے جہاد سے بالکل مختلف ہے۔ جب تک اس فرق کو نہ سمجھا جائے بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کے دور میں جہاد میں ہر مسلمان کو شامل ہونا ہوتا تھا، جدید دور میں یہ بھی تقسیم ہوگیا۔ اب جہاد کے لیے آپ کو اسلحہ چاہیے، اس کے بیچنے والے کون ہیں، اس کی ٹریننگ کون دیں گے؟ یہ بھی پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے۔

ہمیں جہاد کے ساتھ اجتہاد کی بھی ضرورت ہے جب تک جہاد اور اجتہاد دونوں ساتھ چلے اس وقت تک ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی اور جب ہم نے ان دونوں کو علیحدہ کیا تو ہم

مشکلات کا شکار ہو گئے۔ اسلام کی علمی اور سیاسی روایت میں اختلاف کی گنجائش روا رکھی گئی تھی۔

اختلاف اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ موسموں کا اختلاف، رنگوں کا اختلاف، زبانوں کا اختلاف وتنوع حُسن پیدا کرتا ہے۔ اختلاف سے آگے بڑھنے کی راہ نکلتی ہے۔

شوریٰ کا اصول یہ تھا کہ تمام مسئلوں میں صرف ایکسپرٹ ہی کی نہیں بلکہ عوام کی رائے بھی شامل ہونی چاہیے۔ ہم نے آہستہ آہستہ عوام کو اس شورائی نظام سے باہر کر دیا۔ جمہوریت بھی اسی نعرہ کے ساتھ آئی تھی لیکن اب اس جمہوری نظام میں بھی عوام صرف انگوٹھا لگانے کے لیے رہ گئے ہیں۔ امیدوار ۵ سال میں حلقہ میں صرف ایک دو بار آتے ہیں۔ آپ مسائل لے کر MPA یا MNA کے پاس جائیں بھی تو آپ کو وقت نہیں دیا جاتا۔ ہم نے شورائیت سے عوام کو دور کر دیا ہے۔ مسجدوں میں عوام کو شورائیت میں شامل کیا جانا چاہیے۔

اسلام کی علمی روایت مسجد سے شروع ہوئی اور پھر مدارس شروع ہوئے۔ ایک چھت کے نیچے سارے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ ان سارے علوم کا نظریۂ علم (Epistimology) ایک نہیں تھا۔ قرآن کا اور تھا، حدیث کا اور۔ فقہ کا ان دونوں سے بھی مختلف۔ طبیعیات و مابعد الطبیعیات بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اس فرق کے مٹ جانے سے ہماری علمی ترقی رک گئی ہے۔

علمی ڈسپلن کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ اصول الدین میں علم کلام کی آمیزش نے اسے مناظرانہ بنا دیا ہے۔ علم کے لیے نظریۂ علم ناگزیر ہے۔ Facts اور Values میں فرق کرنے سے مغربی علوم بڑی مشکل میں آ گئے ہیں۔ ویلیوز جگہ جگہ موجود ہیں۔ ویلیوز کو نظر انداز کرنے سے معیشت میں تو ترقی ہوگئی لیکن ماحولیاتی آلودگی بڑھ گئی ہے۔ مغربیت اور جدیدیت نے ہمارے اختلاف رائے (Plurality) کو ختم کیا ہے جس کی وجہ سے انہوں نے کہا کہ ثنویت ہونی چاہیے کہ آیا صحیح ہے یا غلط ہے۔ ہماری علمی روایت کو لیں کہ ایک حلال ہے، ایک حرام ہے، بیچ میں تین Spaces ہیں۔ یہ وسعت آپ کو اصولِ فقہ دیتے ہیں۔ یہ اصول فقہ تین طرح کے ہیں: ۱۔ ضروری ۲۔ حاجی ۳۔ تحسینی۔ تحسینی میں آپ کا کلچر اور زبان آتی ہے۔ ان تینوں کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیا جانا چاہیے۔ ہمارے ہاں تحسینی کے ساتھ حاجی کو بھی نہیں لیا جاتا، بس ضروری کو سامنے رکھ کر فتویٰ دے دیا جاتا ہے، وہ بھی کلامی یعنی دفاعی انداز سے۔

سیکولرزم چرچ کی تحریک تھی۔ سیکولر کا مطلب ہے عصری۔ گویا سیکولرزم کا مطلب ہوا ہم

عصری۔ اس میں ہم عصری مسائل کو حل کرنے کی تحریک اٹھائی گئی تھی لیکن بعد میں سیاسی تحریک کے نتیجے میں ثنویت کا شکار ہوگئی۔ سیاسی لوگوں نے مذہب کو دیس نکالا دیا۔

آخری بات یہ کہ شورائیت میں عوام کو شامل کرنا چاہیے۔ اس کے لیے مسجد کو مرکز بنایا جاسکتا ہے آج اس اہم اجلاس کو مسجد میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے میں ڈاکٹر امین اور ان کے رفقاء کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی (سابق ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)

یہ امت زندہ امت ہے اور زندہ دین کی امین ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا تھا کہ اس امت کے آخری لوگوں کی اصلاح کا طریق کار بھی وہی ہوگا جو اس امت کے پہلے لوگوں کی اصلاح کا طریقِ کار رہا ہے۔ اصلاح کا طریق وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقرر فرما گئے ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے امت کی اصلاح کا آغاز کس طرح کیا؟ بلکہ یہ بات اس طرح مکمل ہوتی ہے کہ تمام انبیاء نے اصلاح کے لیے علم کو بنیاد بنایا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اللہ نے علم دے کر بھیجا۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ انسانیت کا آغاز پتھر کے دور سے نہیں ہوا بلکہ بھرپور علم کے ساتھ ہوا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان تھے اور انہیں نبی بنا کر بھیجا گیا۔ منصبِ نبوت کبھی بھی علم کے بغیر نہیں ہوتا۔ یہ علم اکتسابی نہیں بلکہ وہبی ہوتا ہے۔ نبوت کے ساتھ ساتھ انہیں منصبِ خلافت بھی بخشا گیا۔ خلافت کے لیے بھی علم ضروری ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے تعلیم وتربیت کے ذریعے انسانی تاریخ کی بنیاد رکھی۔ علم ایمان اور عقیدہ کی اصلاح کے لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ توحید اور توحید کے تقاضوں کو اور مقاصدِ رسالت کو علم کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ ایمان اور اخلاق تمام انبیاء کی تعلیم کا حصہ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسی نہج پر امت کو تیار کیا۔ لوگوں کے اخلاق سنوارے، انہیں صبر، برداشت اور تحمل اختیار کرنے کا درس دیا بلکہ خود عمل کرکے بھی دکھایا۔ آج بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم امت کا احیاء انہی نبوی خطوط پر کریں جو ایک زندہ اور تابندہ امت بننے کا سبب بنے تھے یعنی ایمان کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاق بھی درست کریں۔

ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین (اسلامی نظریاتی کونسل)

احیاءِ دین کا کام بڑا اہم کام ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ پاکستان میں ہمارے پاس جتنے بھی ماہرینِ علمِ دین ہیں ہم ان کو جمع کریں، بلاتفریق مسلک و جماعت۔ کوئی جماعت اسلامی کا ہو یا تبلیغی جماعت کا، دعوت اسلامی کا ہو یا جماعتِ اہلحدیث کا، سب کو امت کے احیاء کے لیے اکٹھا کیا جائے مثلاً ڈاکٹر اسعد زمان صاحب جو اکنامکس میں ایک سند کا درجہ رکھتے ہیں ان سے مستفید ہوا جائے۔ اسی طرح دیگر اہل علم کو ملا کر ایک تھنک ٹینک بنائیں تاکہ زوال سے نکلنے کی کوئی راہ نکلے۔

اسی طرح کی بات علامہ محمد اسد مرحوم نے جو پاکستان بننے کے ساتھ ہی نظریۂ پاکستان کو مضبوط کرنے کے لیے قائداعظم کے ساتھی تھے، کی تھی۔ احیاء پر علامہ اقبال نے بھی کام کیا۔ تاہم ہمارے معاشرے کے بونے افراد نے محمد اسد صاحب کو بھی کام نہ کرنے دیا اور آج بھی اسی طرح کے افراد رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ یہ کام وسیع المشربی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ اختلافات ترک کر کے مشترکات پر اکٹھا ہوا جائے اور تمام اہل علم زوال سے نکلنے کی تدابیر سوچیں۔ یہ بڑا کام ہوگا۔

ڈاکٹر فخر الاسلام (سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ پشاور یونیورسٹی)

خود احتسابی بڑا مشکل امر ہے۔ یہ جائزہ لینا کہ نقص کہاں ہے، نہ کوئی فرد اس کے لیے تیار ہوتا ہے اور نہ کوئی ادارہ۔ سب اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ ہم جو کر رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ لہٰذا احتساب باہر سے ہی ممکن ہے۔ جدید اصطلاح میں اسے تھرڈ پارٹی ایویلوایشن کہتے ہیں۔ اسے آپ آڈٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر امین صاحب کا یہ اقدام اس حوالے سے قابلِ تحسین ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں (CAFW) کامن اسیسمنٹ فریم ورک (Common Assessment Frame Work) کی طرز پر احیاء اور اصلاح کے لیے ایک فریم ورک وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ تمام دینی سیاسی وغیر سیاسی جماعتوں کی باہمی ہم آہنگی کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ دینی قوتوں کو ان کی ستائش کرتے ہوئے Engage کرنا ہوگا کیونکہ اکثر جماعتیں نقد کو ہضم نہیں کر پاتیں۔ باہم ملاقاتیں ہونی چاہئیں، اس طرح فاصلے کٹتے ہیں اور قربتیں بڑھتی ہیں۔ نیز رابطہ نچلی لیول تک بڑھایا جانا چاہیے۔ تحقیق اور سروے کرائے جائیں کہ زوال کیوں آیا اور اس سے نکلنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ ساری دینی قوتوں کو

مشترکات کی اساس پر متحد کرنے کی کوشش بھی کی جانی چاہیے۔

ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی)

ڈاکٹر امین صاحب ہمارے لیے نمونہ ہیں ہمیں انہیں دیکھ کر حوصلہ ملتا ہے۔ اس مجلس میں اہل علم سے استفادہ ممکن ہوا ہے۔ یہ موضوع بہت اہم ہے جیسا کہ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

تین سو سال سے ہیں ہند کے مَے خانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

آج تحقیق کی بہت ضرورت ہے تاہم اسلام میکانکی تحقیق نہیں چاہتا جیسے مستشرقین کرتے ہیں۔ احیائے اسلام کے اس موضوع پر ہمارے ہاں جو کثرت اور تنوع ہے اس میں کارفرما وحدت کو ہم نظر انداز نہ کریں۔ پھر یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جو جس کام کو کر رہا ہے وہ اسے مکمل دین سمجھ کر کر رہا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔ دعوت وتبلیغ والے بھی جو کام کر رہے ہیں وہ بھی مؤثر ہے اور جو سیاسی میدان میں ہیں ان کے بھی اثرات تو مرتب ہو رہے ہیں۔ ۷۶ سال کسی قوم کی ترقی کے لیے کچھ زیادہ نہیں۔ قوموں کی تشکیل میں بڑے معرکے سر کرنا ہوتے ہیں۔ دینی قوتوں کی محنتوں کی بدولت ہی قرارداد مقاصد جیسی منزل حاصل ہوسکی جس کے مطابق پاکستان کا کوئی قانون غیر اسلامی نہیں بن سکتا۔ ہمیں نظری بحثوں سے نکل کر عملی اقدامات کا سوچنا ہوگا۔ حالات کی تبدیلی کے مطابق اپنے رویوں میں نرمی لا کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔ سب جماعتوں کو مل کر تھنک ٹینک بنانا چاہیے۔ جلد بازی کی بجائے حوصلہ اور تحمل سے منزل ضرور ملے گی۔

ڈاکٹر طاہر محمود (انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی)

عصر حاضر میں احیائے اسلام کے لیے میری چند تجاویز ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ امت مسلمہ فکری، عملی اور سیاسی انحطاط کا شکار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اصل کی طرف لوٹیں۔ امت کا پہلا گروہ جن خطوط پر چل کر کامیاب وکامران ہوا تھا امت کے آخری گروہ کو بھی انہی خطوط پر چلانا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے دو چیزیں قرآن وسنت ہمارے لیے چھوڑیں جو ہر زمانے میں مشعل راہ بننے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہیں۔ اصلاح کا آغاز تعلیم

سے ہوگا مگر تعلیم کے ساتھ تربیت وتزکیہ ہوتو منزل ضرور حاصل ہوگی۔ہم اپنی نجی واجتماعی زندگی میں قرآن وسنت کو ترجیح بنالیں تو ان شاءاللہ افراد بدلیں گے،افراد سے معاشرہ بدلے گا اور پھر ان شاءاللہ امت میں رجال سازی کا عمل شروع ہوجائے گا جو بالآخر امت کے عروج کا باعث ہوگا۔

مولانا تنویر احمد علوی (جامعہ محمدیہ، اسلام آباد)

یہ نہایت اہم موضوع ہے۔احیاء اور تجدید کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے اور رہے گی تاکہ دین کی اصل صورت اور مقصد زندہ رہے۔ہم برصغیر کے تناظر میں دیکھیں تو شیخ مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا کام اس موضوع پر بڑا گہرا ہے۔اسلامی تہذیب وثقافت کی بقا اور احیاء کے لیے تمام دور کے علماء حق نے اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔سید احمد شہیدؒ کا کردار اور سرسید کی علمی تحریک کے ساتھ دارالعلوم دیوبند نے احیائے اسلام میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہمارے تعلیمی نظام میں احیاء کی ضرورت ہے۔اس ضمن میں اہل علم کو کلیدی کردار ادا کرنا چاہیے۔مقاصدِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔آج کے میڈیا کو بھی چیلنج کے طور پر لینا چاہیے۔اس مقصد سے ملت کے نوجوانوں کو تیار کرنا بھی ضروری ہے۔

مولانا محمد رمضان علوی (جمعیت علمائے اسلام وشریعہ کونسل)

دینی جماعتوں اور تحریکوں نے جو کام کیے ہیں ہمیں ان کی کاوشوں کی تحسین کرنی چاہیے۔انہیں ناکام اور غیر مؤثر نہیں کہنا چاہیے۔یہ لوگ اپنے اپنے دائرے اور اختیار کے مطابق کام کررہے ہیں۔تاہم اپنے دشمن کو کمزور بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔عصرِ حاضر کے چیلنج کو جان کر نئی حکمت عملی سے دین کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ اس کو غالب کرنے کی حکمت عملی وضع کرنی چاہیے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام دینی جماعتیں متحد ہوکر لائحہ عمل ترتیب دیں۔سیکولرزم دینداری کے خلاف منظم نظام ہے لہٰذا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی منظم جدوجہد ضروری ہے۔

مفتی عبدالرحمٰن

احیائے اسلام وقت کی ضرورت ہے۔احیائے اسلام کی تحریکیں ہر دور میں وقتاً فوقتاً اٹھتی رہی ہیں مگر وہ مؤثر وکارآمد نہ ہوسکیں۔اس ناکامی کی وجہ منہج انقلاب نبوی کی درست تفہیم نہ ہونا

ہے۔ اگر ہم سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے اس پہلو پر امت کی تربیت کریں تو احیاء امت کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے 'منہج انقلابِ نبوی' نامی اپنی کتاب میں درجہ بدرجہ اس بات کو مفصل بیان کیا ہے۔

خلیل الرحمٰن چشتی (جماعت اسلامی)

اسلام نے تبدیلی کے لیے علم کی روایت ڈالی ہے۔ ہم نے علم پروری نہیں کی بلکہ شکم پروری کی ہے۔ طلبہ کو چاہیے کہ روزانہ کی بنیاد پر مطالعہ کریں علم نہیں بلکہ بہت سارے علوم پر دسترس حاصل کریں۔ ان علوم کے ذریعے سے معاصر چیلنجز کو سمجھنے میں اور ان سے نمٹنے میں مدد ملے گی۔ ہمارے دین کا آغاز ہی اقراء سے ہوا تھا کہ پڑھو۔ پڑھو گے تو آگے بڑھو گے۔

مغرب کا نظامِ مملکت جس جمہوریت کا دعویدار ہے وہ محض طاقت پر کھڑا ہے۔ ہر شخص طاقت اور بدمعاشی کے بل بوتے پر عوام پر جبراً قابض ہے۔ یہاں نعرہ تو عوام کی حکومت کا ہے مگر چند طاقتور لوگ بندر بانٹ کر کے ملکی وسائل پر قابض ہو جاتے ہیں یہ تمام نظام عوام کے شعور کو مفقود کر کے حکومت کر رہا ہوتا ہے۔ جو ہوتا ہے وہ دکھایا نہیں جاتا اور جو دکھایا جاتا ہے وہ ہوتا نہیں۔ لہٰذا خدا مرکز God-Centered معاشرہ ناگزیر ہے۔ اس معاشرے کی تشکیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لائے ہوئے نظام کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا ہم سب کو سیرت رسول کو مرکز بنانا ہوگا۔

عابد اقبال کھاری (صدر پازیٹو پاکستان)

عابد اقبال کھاری صاحب نے کلام اقبال کے ذریعے خوابیدہ امت کو جگانے کا عزم کیا۔ بھرپور طریقے سے شرکاء محفل کے لہو کو گرمایا۔ شکوہ، جوابِ شکوہ کے اشعار کے ذریعے سمجھایا کہ ہمارا مرکز رسول اللہ کی ذات ہونی چاہیے۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ڈاکٹر انعام اللہ (اٹک)

امت عصرِ حاضر کے چیلنج کو سمجھ نہیں پائی۔ ہر شخص معاش کی فکر میں ہے، آخرت کی فکر جو

ہماری ترجیح ہونی چاہیے اس سے ہم غافل ہیں۔امت کے افراد عمل سے خالی ہیں جو عمل کر رہے ہیں ان کے اعمال روح سے خالی ہیں۔تبدیلی جو اس امت کا طرہ امتیاز تھی اس سے ہم سب غافل ہیں۔قولی تبلیغ تو ہو رہی ہے عملی تبلیغ سے ادارے بھی خالی ہیں اور ہمارے کوچہ و بازار بھی۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

ڈاکٹر امین صاحب قابل تحسین ہیں جو ہمیں سوچنے کی راہ پر ڈال رہے ہیں۔اللہ کرے ہم گہرائی سے سوچیں اور عمل کی کوئی سبیل نکالیں۔

بقیہ: جسٹس ڈاکٹر محمد الغزالی مرحوم

یہ غالباً ۲۰۰۵ء کی بات ہے کہ مَیں نے عصرِ حاضر میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے خدوخال کے بارے میں اسلام آباد کے اہل علم کے ساتھ ایک نشست رکھنا چاہی۔ڈاکٹر محمود احمد غازی (مرحوم) سے مشورہ کیا تو کہنے لگے کہ کیوں ہوٹلوں میں پیسے خرچ کرتے ہو۔ میرے ہاں آجاؤ، کھانا بھی کھائیں گے اور اس موضوع پر بات بھی کرلیں گے۔ڈاکٹر غزالی صاحب نے کہا: بھئی میری شرط یہ ہے کہ احمد جاوید صاحب کو بھی ساتھ لاؤ۔مَیں نے کہا: ٹھیک ہے۔چنانچہ لاہور سے مَیں، احمد جاوید صاحب اور پروفیسر ملک محمد حسین (مرحوم) اسلام آباد آئے جبکہ غازی صاحب نے ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب (اُس وقت وائس پریزیڈنٹ اسلامی یونیورسٹی) اور ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی (اس وقت اسلامی یونیورسٹی کے ڈین سوشل سائنسز) کو بلالیا۔ڈاکٹر غزالی صاحب بھی موجود تھے۔یوں یہ نشست تین چار گھنٹے جاری رہی اور زیرِ بحث موضوع پر تفصیل سے تبادلۂ خیال ہوا۔اُس نشست کا تفصیلی احوال پھر کبھی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ غزالی صاحب تزکیہ وتصوف کے میلان کی وجہ سے احمد جاوید صاحب سے محبت کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کی آخرت کی منزلیں آسان فرمائے اور ہم جیسوں کو آخرت کی فکر عطا فرمائے۔آمین اللّٰھُمَّ ربنا آمین۔

فکرو دانش

مدثر رشید[۱]

پاکستان میں احیائے اسلام

دینی قوتیں کیوں کامیاب نہیں ہوسکیں؟

دسمبر ۲۰۲۳ء کے آغاز میں محترم جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب کی ایک کتاب کی pdf موصول ہوئی جس کا عنوان تھا 'پاکستان کی دینی قوتیں غیر موثر اور ناکام کیوں؟' اور اس کے ساتھ ہی ان کی طرف سے ۱۷ دسمبر کو منعقد ہونے والے ایک سیمینار جس کا عنوان بھی اسی کتاب کے موافق تھا، موصول ہوا۔ احقر بھی کیونکہ احیائے اسلام کے لیے برپا اس مساعی سے پچھلے ۱۸ سال سے وابستہ ہے اور یہ موضوع کم از کم ۱۰ سال سے تو مطالعے اور تحقیق کا مرکز رہا ہے، اس لیے پہلے تو فوراً ڈاکٹر صاحب کو اس عنوان پر کتاب لکھنے اور ساتھ ہی اس پر اسلام آباد میں سیمینار منعقد کرنے پر مبارکباد پیش کی اور اس میں شرکت کا تہیہ کرلیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ مجھے بھی اس سیمینار میں کچھ گفتگو کرنی ہے تو کچھ نوٹس بنا لیے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے تاکید کر دی تھی کہ مقررین کی زیادہ تعداد کی وجہ سے ہر ایک کے حصے میں دس پندرہ منٹ ہی آپائیں گے۔ اب اتنے سالوں کے مشاہدے اور مطالعے کو دس پندرہ منٹ میں پیش کرنا ایک بڑا چیلنج بن گیا۔ خیر جیسا تیسا بھی تیار ہو سکا ۱۷ دسمبر کو مسجد قرطبہ E-11 میں منعقدہ اس سیمینار میں پیش کر دیا جسے بفضل اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب سمیت دیگر شرکاء نے بھی خوب سراہا۔ بعد ازاں ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا کہ وہ اس سیمینار کی روداد البرہان کے آئندہ شائع ہونے والے شمارے میں پیش کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے انہیں یہ نکات درکار ہیں جن کو میں نے سیمینار میں پیش کیا تھا۔ خیر تقریر کے لیے تو میں نے اپنے خیالات کو ذہن میں مجتمع کر کے بس کچھ عنوانات ہی مرتب کیے تھے، اس لیے سوچا کہ ان عنوانات سے تو ڈاکٹر صاحب کو بھی تفصیل جاننے میں دقت ہوگی اور ان کے قارئین بھی شاید ان کو صحیح معنوں میں نہ سمجھ پائیں۔ اس لیے اس مختصر مضمون میں ان نکات کو مختصر تشریح کے ساتھ مرتب کرنے کی

---

[۱] صدر دی ریوائیول فاؤنڈیشن، اسلام آباد

کوشش کی ہے۔ اس میں اکثر باتیں تو وہی ہیں جو میری تقریر میں پیش ہوگئی تھیں باقی کچھ نکات جو وقت کی قلت کی وجہ سے رہ گئے تھے ان کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ امید ہے کہ احیائے اسلام کی جدوجہد سے وابستہ کارکنان ان نکات پر غور کریں گے اور اس کے نتیجے میں اس تجدید ی مساعی میں وہ جدت آسکے گی جو اس کو موثر اور کامیاب بنانے کے لیے ناگزیر ہے۔

۱۔ نصب العین اور مقاصد کے حصول کے لیے ناکارہ وسائل پر انحصار کی روش برقرار رکھنا

احیائے اسلام کے لیے برپا اسلامی تحریکوں کے غیر موثر ہونے کی یہ ایک بڑی وجہ ہے۔ سب تحریکوں کے عمائدین یہی دعوی کرتے ہیں کہ ان کے مناہج سیرت سے ماخوذ ہیں لیکن یہ سب سیرت کے اہم ترین اصول کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ واضح سنت تھی کہ جو بھی کام کرتے اس کے لیے درکار کارآمد وسائل کی نشاندہی کر کے ان کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرتے اور اس کے بعد اللہ پر توکل کرتے۔ لیکن اسلامی تحریکوں کا طرز عمل اس کے برعکس ہے۔

جمہوری الیکشنز کا ناکارہ ہونا بارہا ثابت ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود جماعت اسلامی اور دیگر اسلامی سیاسی تنظیمیں مصر ہیں کہ تبدیلی اسی ذریعے سے ہی آئے گی۔ حالانکہ وہ ممالک جہاں یہ صحیح معنوں میں نافذ ہے خود اس سے پریشان ہیں۔ امریکی الیکشنز میں جب ٹرمپ کی جیت ہوئی تو وہاں کسی نے کیا خوب تبصرہ کیا تھا کہ سیاستدانوں کو چاہیے کہ فارمولا ون ریس کے ڈرائیورز کی طرز کی جیکٹیں پہن لیں جن میں سپانسرز کے نشانات پرنٹڈ ہوتے ہیں تاکہ معلوم تو ہو جائے کہ ان کا سپانسر کون ہے۔ گویا کہ حالات وہی ہیں جن کا نقشہ اقبال نے خوبصورتی سے کھینچا تھا:

ہے وہی سازِ کُہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طِبِّ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری

گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس، الاَماں!
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

یہ تو حال جمہوریت کے اپنے سب سے بڑے وکیل کے ہاں ہے، رہی بات پاکستان کی تو یہاں تو اس کی حالت اس سے کہیں زیادہ ابتر ہے۔ اب اس بے کار وسیلے کو اپنا کر یہ خواب دیکھنا کہ اس سے تبدیلی آجائے گی کہاں کی عقل مندی ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے جب انقلاب کے ذریعے تبدیلی لانے کا منہج پیش کیا تو ان کا اس ضمن میں خاکہ یہ تھا کہ ایک لاکھ تربیت یافتہ کارکنان کی مضبوط اجتماعیت تیار کی جائے اور پرامن منظم غیر مسلح جدوجہد کے ذریعے نظام تبدیل کر دیا جائے۔ اب اس طرح کیسے تبدیلی لائی جاسکتی ہے؟ یہ نظام نہ تو یکبارگی مسلط ہوتا ہے اور نہ ہی ایک ہی ہلے میں اس کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ نیز یہ ایک لاکھ کارکنان کہیں الگ سے ایسے ماحول میں تیار ہو ہی نہیں ہو سکتے جہاں نظام کے خلاف مزاحمت کا آغاز ہی نہ ہوا ہو۔ لیکن اس کے باوجود یہ سوچ رکھنا کہ چاہے سیکڑوں سال لگ جائیں ایک لاکھ کارکنان تیار کر کے انقلاب آجائے گا بے کار وسائل پر انحصار نہیں تو اور کیا ہے؟

اسی طرح بعض بھائیوں کا خیال ہے کہ محض دعوت و اصلاح سے اہل قوت کو قائل کیا جائے اور پھر ان کی مدد سے حکومت پر قبضہ کر کے دین نافذ کر دیا جائے۔ یہ بھی ایک انہونی بات ہی ہے۔

یہ سب ایک دور کے دھندلے خواب (Vague Distant Dream) کے پیچھے چل رہے ہیں اور آج کے تقاضوں سے ناواقف ہیں۔ ٹھیک ہے الیکشن میں جیت کبھی ہو جائے گی، انقلاب بھی کبھی آجائے گا اور اہل قوت بھی شاید کہیں مستقبل میں جا کر نصرت فراہم کر دیں لیکن اصلاحات (Reforms) کا ایک بہت بڑا دائرہ ہے جس میں آج کام کیا جاسکتا ہے۔ ریاستی ادارے، پالیسیاں، قوانین وغیرہ کی Reforms اور ان کی Islamization

کے تحت بہت سا کام کرنے کی آج ضرورت ہے جس سے سب غافل ہیں۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ کام کرنے سے ہی وہ Political Capital حاصل ہوسکتا ہے جس کے ذریعے الیکشنز میں بھی کچھ کامیابی حاصل ہونے کا امکان ہے اور انقلاب برپا کرنے کے لیے بھی عوام کو اکٹھا کرنا ممکن ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے پاکستان میں سیکولر اور لبرل لابی اقلیت میں ہونے کے باوجود کامیابیاں حاصل کرتی آئی ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر ہم بھی اس طریقہ کار کو اپنا لیں تو اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ان سے کہیں زیادہ موثر ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں جن کو آج سرانجام دینا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے تاکہ غلبۂ دین کے بڑے مقصد کی طرف پیش رفت کو یقینی بنایا جا سکے۔

۲۔ اسلامی تحریکوں کا جمہوریت کو اپنا لینا

جمہوریت مغرب کا تیار کردہ وہ فرسودہ نظام ہے جس سے وہ آج خود تنگ آئے ہوئے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں فیصلہ سازی اکثریت کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے۔ اب اکثریت کے بارے میں تو مشاہدہ یہی ہے کہ وہ نادان ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی اپنی رائے کے حق میں فیصلہ کروانا چاہتا ہے تو اسے لامحالہ نادان اکثریت کو دھوکہ دینے کا گُر سیکھنا ہوگا۔ یہ نظام ہی ایسا ہے کہ اس میں اخلاقیات کا جنازہ لازماً نکلے گا۔ اس میں گروہ بندیاں ہوں گی، گروہوں میں رسہ کشی ہوگی اور نفرتوں کا ماحول پروان چڑھے گا اور کبھی بھی اہل اور مخلص قیادت اوپر نہیں آسکے گی۔ لیکن اس سب کے باوجود بعض دینی تحریکوں اور جماعتوں نے اسے حرزِ جاں بنایا ہوا ہے۔

۳۔ منہج سے متعلق غیر ضروری Dichotomies کا قیام

اسلامی تحریکوں کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی رہا کہ ان کے عمائدین نے منہج کے حوالے سے غیر ضروری ثنویات (Dichotomies) قائم کر لیں جن کی وجہ سے اتحاد پیدا نہیں ہو سکا مثلاً:

۔ انتخابی سیاست بالمقابل انقلابی سیاست(Electoral Politics Vs Revolutionary Politics): ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اس دونوعیتی تعلق کو قائم کیا حالانکہ

اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ دونوں قسم کی سیاست ایک ساتھ بھی کی جا سکتی ہے۔

- اصلاح بالمقابل انقلاب (Reform Vs Revolution): اس dichotomy کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان دونوں کو ایک ساتھ کرنے کی ضرورت ہے۔ انقلاب کے لیے جو political capital درکار ہے وہ اصلاح کے کام کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ محض اصلاح کے ذریعے نظام تبدیل کرنے کے خواب دیکھنا خام خیالی ہے۔

- تبدیلی اوپر سے آئے گی بالمقابل تبدیلی نیچے سے آئے گی: اب ظاہر ہے پائدار تبدیلی برپا کرنے کے لیے دونوں تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اگر صرف اوپر سے تبدیلی کی کوشش جاری رہی تو وہ اہل افراد مہیا ہی نہیں ہوں گے جو نظام کو تبدیل کرنے اور بعد ازاں نظام چلانے کے لیے درکار ہیں۔ اس کے برعکس اگر صرف عوام میں ہی کوشش جاری رہی اور نظام کو ایسے ہی چھوڑے رکھا تو نظام ان سب کاوشوں پر مسلسل پانی پھیرتا رہے گا جو عوامی سطح پر کی جاتی رہی ہیں۔

۴۔ دینی قوتوں کی جدوجہد کا مجتمع نہ ہوسکنا

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسی بھی جگہ تبدیلی اس وقت تک نہیں آتی جب تک کہ ایک نظریے سے منسلک لوگوں کی جدوجہد مجتمع نہیں ہو جاتی۔ ان قوتوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کچھ کوششیں ضرور ہوئیں لیکن ناکامی ہی سب کا مقدر ٹھہری اور شاید یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایک ایسا قائد پیدا نہ ہو جائے جس پر سب متفق ہو جائیں۔ اس لیے اس کی صرف ایک ہی سبیل نظر آتی ہے کہ ایک ایک کر کے متفقہ مسائل کے حل کے لیے سب کو متحد ہونے کی دعوت دی جائے۔ ایسا ماضی میں بھی ممکن ہوسکا جیسا کہ قادیانیوں کو کافر قرار دینے کا معاملہ، سود کی حرمت کا معاملہ یا حال ہی میں ٹرانسجینڈر ایکٹ کے خلاف ہونے والی جدوجہد کا معاملہ ہے۔ چنانچہ اب اسی نہج پر کوششوں کو مجتمع کرنے کی کاوش کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہے، اس لیے اسے اپنانا چاہیے۔

۵۔ سوچ میں ہمہ گیریت کا پیدا نہ ہوسکنا

یہ اکثر سننے کو ملتا ہے کہ دین کے بہت سے گوشے ہیں اور ہم نے تو بس یہ گوشہ پکڑا ہوا

ہے، ہم اسی میں کچھ کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں، باقی گوشوں میں کام کرنے کی بھی ضرورت ہے لیکن ہم تو بس یہی کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ بظاہر یہ بات بہت صائب معلوم ہوتی ہے لیکن غور سے تجزیہ کیا جائے تو اس میں ایک بہت بڑا چور دروزہ چھپا ہوا ہے جو اتحاد پیدا نہ ہو سکنے کا اصل سبب ہے۔ دین کے مختلف گوشے ضرور ہیں لیکن یہ سب ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ دین مکمل ضابطۂ حیات ہے اور بیک وقت سب گوشوں میں دین کی بالا دستی قائم کرنا اخروی نجات کے لیے لازم ہے۔ اگر سوچ میں یہ ہمہ گیریت ہوگی تو پھر یہ رویہ پروان چڑھے گا کہ ٹھیک ہے ابھی اس وقت کسی کے پاس اگر دین کے کسی ایک یا کچھ گوشوں میں کام کرنے کی استطاعت موجود ہے تو وہ اس میں مصروف عمل رہے اور ساتھ ان کاوشوں کی بھی قدر کرے جو دین کے دیگر گوشوں میں چل رہیں ہیں کیونکہ وہ ان کو بھی اتنا ہی اہم سمجھے گا جتنا ان کاموں کو سمجھتا جس میں وہ خود مصروفِ عمل ہے۔ لیکن جب سوچ یہ ہے کہ دین کے کسی بھی گوشے میں کام کر لیں تو وہ غلبۂ دین کی جدوجہد ہی ہے تو ایسی محدود سوچ کے ساتھ کسی دوسرے گوشے میں جدوجہد کرنے والی اجتماعیت کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ سوچ میں ہمہ گیریت ہوگی تو ہی اتحاد کی راہیں کھلیں گی۔

۶۔ تنظیمی نظام مقاصد کی بجائے سرگرمیوں پر استوار کرنا

یہ تو شاید امت مسلمہ میں موجود ہر قسم کی اجتماعیت کی ناکامی کا اصل سبب ہے۔ دنیا جہان میں اجتماعیتیں اسی لیے موثر ہوتی ہیں کہ وہاں سرگرمی سے زیادہ مقصد کی اہمیت ہوتی ہے۔ سرگرمی محض مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اسی لیے سب اجتماعیتوں میں ایک سے لے کر پانچ سالوں تک مقاصد طے ہوتے ہیں اور پھر مسلسل ان کی طرف ہونے والی پیشرفت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی تحریکوں کا معاملہ یہ ہے کہ مقاصد سرے سے طے ہی نہیں کیے جاتے بس سرگرمیوں پر ہی کارکنان کی توانائیاں صَرف ہوہتی رہتی ہیں۔ کوئی جائزہ نہیں لیا جاتا کہ یہ سب کس حد تک موثر ہے؟ اس وجہ سے ان اجتماعیتوں میں اور بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

٭ مقاصد کی بجائے نظم کا ہی مقصود بن جانا

جیسا کہ پہلے بیان ہوا مقاصد کا حصول اگر مدنظر ہو تو نظام العمل اور اس کے تحت ہونے والی سرگرمیوں کو تبدیل کرنا ممکن ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر مقاصد کو حاصل کرنا مطلوب ہی نہیں تو پھر جو نظام العمل چل رہا ہے وہی درست ٹھہرے گا اور وقت کے ساتھ اس پر ہونے والی تعمیل سے یہ پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ یہی خود مقصود بن جائے گا اور ایسا ہی ان تنظیموں اور تحریکوں میں میں ہوتا رہا ہے۔

٭ غیر موثر جدوجہد یا معمول کی کاروائی پر اکتفا کر لینے کے رجحان کا پروان چڑھنا

جب یہ جائزہ لینا ممکن ہی نہ رہے کہ نظام العمل موثر ہے یا غیر موثر تو پھر کارکنان میں معمول کی کاروائی پر اکتفا کرنے کا رجحان پروان چڑھ جاتا ہے اور نتیجہ ایک غیر معیاری اور غیر موثر کارکردگی کی صورت میں نکلتا ہے۔

٭ فکری و عملی جمود

اس سب کے نتیجے میں عملی جمود بھی آجاتا ہے اور کچھ عرصے اسی طرح غیر موثر جدوجہد کرنے کے بعد جب نصب العین کی طرف پیش رفت نہیں ہو پاتی تو فکر میں بھی جمود آجاتا ہے۔

٭ ہر سطح پر میرٹ کا پسِ پشت ڈال دیا جانا

جب نظام العمل اور سرگرمیاں ہی مقصود بن جاتی ہیں تو پھر ایسی اجتماعیت میں موثر کام کرنے اور مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے والے اہل کارکنان کی بجائے ان معمول کی کاروائی کرنے والوں کی قدر زیادہ بڑھ جاتی ہے جن کے مرہون منت نظم قائم ہے۔ نتیجتاً اجتماعیت کی ہر سطح پر میرٹ کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے اور اجتماعیت کی قیادت نااہل کارکنان کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

۷۔ سٹرٹیجیٹک پلاننگ کا فقدان

یہ بھی امت مسلمہ کا اجتماعی مسئلہ ہے کہ مسلمان سٹرٹیجیٹک پلاننگ سے بے بہرہ ہیں۔ نہ ان کی حکومتیں اس کا اعادہ کرتی ہیں اور نہ ہی معاشرتی ادارے۔ دینی تحریکوں کا بھی

یہی معاملہ ہے۔ دوسری طرف اغیار کو دیکھا جائے تو انہوں نے ہزار ہزار سال کی سٹرٹیجیٹک پلاننگ کر رکھی ہوتی ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ ایک سال کا پلان موجود نہیں ہے۔بغیر کسی منصوبے اور حکمت عملی کے کوئی بڑا کام کیسے سرانجام پا سکتا ہے؟

۸۔ تنظیمی ڈھانچوں کا شعبہ جات پر مبنی نہ ہونا

اکثر اداروں اور تنظیموں کا یہ مسئلہ ہے کہ ان کے تنظیمی ڈھانچے ہی ایسے ہیں جن کے تحت کوئی موثر جدوجہد نہیں کی جاسکتی۔زیادہ تر تنظیمی ڈھانچوں میں شعبہ جات موجود نہیں ہیں۔بس جغرافیائی لحاظ سے ڈویژنز کی تقسیم ہے اور ہر علاقے کا ایک ذمہ دار مقرر کر دیا جاتا ہے۔اب اس علاقے سے چاہے کوئی بہت بڑا محقق شامل ہوجائے یا کوئی مزدور دونوں کو اسی ایک ذمہ دار کے تحت منسلک کر دیا جاتا ہے۔اس طرح مختلف النوع مہارتیں،علوم اور تجربات رکھنے والے کارکنان کو سنبھالنا ایک ذمہ دار کے ذمے لگا دیا جاتا ہے۔اس طرح کا انتظام سنبھالنے کے لیے تو نہایت ہی تجربہ کار اور ہر فن مولا قسم کی قیادت چاہیے ہوتی ہے جو عموماً ناپید ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کارکنان بدظن ہو کر یا غیر فعال ہوجاتے ہیں یا تحریک کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جدید اجتماعیتوں میں شعبہ جات میں کام کو منقسم کر کے ہر شعبہ کے ماہر کو اس کے متعلقہ شعبے پر تعینات کیا جاتا ہے اور اس کو اسی نوعیت کے کام میں دلچسپی اور مہارت رکھنے والوں کو چلانا ہوتا ہے۔ایسے تنظیمی ڈھانچے میں ہر فن مولا قیادت کی بجائے کسی خاص شعبے سے متعلقہ ماہر قیادت درکار ہوتی ہے جو عموماً بآسانی دستیاب ہوجاتی ہے۔اس کے علاوہ بھی کئی موثر تنظیمی ڈھانچے موجود ہیں جن کو نافذ کر کے موثر جدوجہد کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

۹۔ غلبۂ دین کی بجائے جماعت یا تحریک کی بقاء کو مقصود بنالینا

غلبۂ دین کی جدوجہد میں ایسے مراحل لامحالہ آتے ہیں جب طاغوتی قوتیں اجتماعیت کی ہی بساط لپیٹ دینے کی دھمکیاں دینے لگتی ہیں۔اس وقت ایسی تحریک یا تنظیم کی قیادت کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ ان دھمکیوں سے مرعوب ہو کر اپنی پالیسی کو ان کی منشا کے مطابق کر کے اجتماعیت کی بقا کی ڈیل کرتے ہیں یا ان کو صاف انکار کر کے اپنے موقف پر ڈٹ کر اللہ پر توکل کرتے ہوئی اجتماعیت کو قربان کرنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔اگر فیصلہ اول الذکر ہو تو صاف

ظاہر ہے کہ مقصود غلبۂ دین نہیں بلکہ اب خود یہ تنظیم اور اجتماعیت بن چکی ہے۔ باقی اس سودے کا جواز تو شیطان کی طرف سے فراہم ہو ہی جاتا ہے کہ اتنی بڑی اجتماعیت ہے، اتنا خیر اس سے پھیل رہا ہے، اس لیے اس کو جیسے تیسے ہی سہی چلتے رہنا چاہیے وغیرہ۔

۱۰۔ صحیح اسلامی فکر کی تنظیم کرنے اور اس کو آج کے مخاطبین تک ان کے مزاج کے مطابق پہنچانے میں ناکامی

تحریکات اسلامیہ کی ناکامی اور غیر موثر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہے کہ انہوں نے دین کی صحیح فکر کو عصرِ حاضر کے مخاطبین (Target Audience) کے لیے تیار نہیں کیا۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ پوری فکر کو منظم کر کے اس کی ہر دور کے لیے تشکیلِ نو نہ کر لی جائے۔ ہر جماعت یا تحریک کے پاس بانیان کی کتب اور لیکچرز کا ایک ذخیرہ موجود ہے لیکن اس میں سے تصورات کو نکال کر ان کی تنظیم اور جدید دور کے لیے تشکیلِ نو نہیں کی جا سکی۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ فکر آنے والی نسل میں صحیح طرح منتقل ہی نہیں ہو پا رہی جس کے بغیر اس تجدیدی مساعی کا موثر ہونا ممکن نہیں ہے۔

۱۱۔ اہل لیڈرشپ اور فعال کارکنان کی تیاری میں مسلسل ناکامی

اسلامی تحریکوں کے نظام ہائے تربیت کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اہل قیادت اور معتدبہ تعداد میں فعال کارکنان تیار نہیں کر پایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو تیار کرنے والوں کو آج کے دور میں اعلائے کلمۃ اللہ کے عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو علوم اور ہنر درکار ہیں ان کا ادراک ہی نہیں تھا۔ نیز اس مقصد کے حصول کے لیے جو اخلاقی، بدنی اور روحانی تربیت درکار تھی اس کے لیے کوئی بندوبست یہ نہ کر سکے۔

۱۲۔ کارکنان کو ان کے commitment levels، ان کے مزاج، ان کے skill sets کے مطابق استعمال نہ کر سکنا

اسلامی تحریکوں کی ناکامی اور غیر موثر ہونے کی یہ بھی ایک بہت بڑی وجہ ہے کہ ان کے

ساتھ منسلک ہونے والے ممبران کو یہ صحیح طریقے سے استعمال ہی نہ کر سکے۔لوگوں کے مزاج مختلف، ان کے skill sets مختلف اوران کے commitment levels مختلف ہوتے ہیں لیکن تحریکوں کے نظام ہائے تربیت اور نظام ہائے عمل سب کے لیے یکساں ہیں۔گویا کہ ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنے کے اصول پر سب کاربند ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں مخلص کارکنان آج غیر فعال ہیں صرف اس لیے کہ انہیں ان کے مزاج اور اہلیت کے مطابق استعمال ہی نہیں کیا جاسکا۔

۱۳۔ ایمان سے متعلق تصورات کے مفاہیم اوران کی عقلی بنیادوں سے متعلق ارکان اورمعاشرے دونوں میں آگاہی پیدا کرنے میں مسلسل ناکامی

غلبہ دین کے لیے جو رضا کار درکار ہیں ان کی اس مقصد کے حصول کے لیے کی جانے والی جدوجہد کا اصل محرک جذبۂ ایمان ہی ہے۔لیکن اس ضمن میں بھی اسلامی تحریکیں کوئی خاطرخواہ بندوبست نہیں کر پائیں کہ کارکنان میں ایمان کی بلند سطح کیسے حاصل کی جاسکتی ہے؟ ایمان کے حصول کے غیرعقلی ذرائع کثرتِ ذکروعمل اورصحبتِ صالحین توامت میں معروف ہیں ہی لیکن مطلوبہ سطح کا ایمان حاصل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ایمان کے حصول کے عقلی ذرائع فراہم نہیں کیے جاتے۔ایمان کی عقلی بنیادوں کوفراہم کر کے کارکنان اور پھر معاشرے کے سوچنے سمجھنے والے افراد میں ایمان کی بلندتر سطح پیدا کیے بغیر غلبۂ دین کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

۱۴۔ انسانی حقوق سے متعلق اسلامی تصور کے بارے میں شعور پیدا نہ کرسکنا:

جیسا کہ اوپر بیان ہوا غلبۂ دین کے لیے ہونے والی جدوجہد کا اصل محرک تو ایمان ہی ہے اوراس کوایک خاص سطح تک اسلامی تحریکوں کے کارکنان اورمعاشرے کے سوچنے سمجھنے والے افراد میں پیدا کرنا اس مقصد کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔اس ضمن مین دوسرا بڑا محرک اگر ہوسکتا ہے تو وہ انسانی حقوق کا تصور ہے ۔لوگ اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اصلاحِ احوال کے لیے کھڑے نہیں ہو پا رہے تو کم ازکم اپنے حقوق کے حصول کے لیے ہی

کھڑے ہو جائیں۔ یہ بھی ایک بہتر بڑا محرک ہے جس کی بنا پر انیسویں اور بیسویں صدی میں بڑی بڑی تحریکیں دنیا بھر میں کھڑی ہوئیں اور انقلابات بھی برپا ہوئے۔ لیکن اگر مسلم دنیا کا جائزہ لیا جائے تو اس میں زیادہ تر تحریکیں اس بنا پر کھڑی ہوئیں کہ نظام کی تبدیلی ایک دینی فریضہ ہے۔ اس بنا پر شاذ ہی تحریکیں اٹھیں کہ نظام کی تبدیلی اس لیے ضروری ہے کہ اس سے عوام کو ان کے بنیادی حقوق ملیں گے۔ اس ضمن میں بلاشبہ UN کا Universal Declaration of Human Rights جو ۱۹۴۸ء میں پاس ہوا اہمیت کا حامل ہے لیکن اس میں جو تصورِ حقوقِ انسانی پیش کیا گیا ہے وہ بہت سے اعتبارات سے اسلام سے متصادم ہے۔ اس کے مقابلے میں Cairo Declaration on Human Rights in Islam جو OIC نے ۱۹۹۰ء میں پاس کیا تھا ایک بہترین دستاویز ہے جس میں حقوقِ انسانی کے اسلامی تصور کو پیش کیا گیا ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس بنا پر پوری مسلم دنیا میں شعور بیدار کیا جاتا تاکہ احیائے اسلام کی جدوجہد کو اس سے جلا ملتی لیکن ایسا تا حال نہیں ہو سکا۔ احیائے اسلام یا غلبۂ دین کے لیے جدوجہد یقیناً اللہ کی رضا کی خاطر ہی ہونی چاہیے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے حصول کے بعد عوام کو ان کے حقوق بھی مل پائیں گے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مختص کیے ہیں۔ اس پہلو کو بھی واضح کرنے سے احیائے اسلامی کی اس مساعی کو بہت فائدہ مل سکتا ہے۔

۱۵۔ تحقیقی سوچ کا فقدان

یہ بلاشبہ دین اسلام ہی تھا جس نے ہر قسم کی توہمات اور من گھڑت روایات کو ردّ کر کے تحقیقی سوچ کو پروان چڑھایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿36﴾﴾ [الاسراء۱۷:۳۶]

''اور اس بات کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں، بیشک کان اور آنکھ اور دل ان سب کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

لیکن اس کے برعکس امتِ مسلمہ میں خلافتِ بنوعباس کے بعد جو متاخرین کا تصوف

رائج ہوا تو تحقیقی سوچ رفتہ رفتہ ناپید ہو کر رہ گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ایک امتی کے لیے آنکھ بند کر کے کسی پیر یا کسی شیخ کے پیچھے چلنا ہی دین ٹھہرا ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب آج کے مسلمان بالخصوص ہندی مسلمان کی اس روش کو واضح کیا ہے ۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد

تاویل کا پھندا کوئی صیّاد لگا دے
یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

جیسا کہ مغرب میں جب عیسائیت کے اثر و رسوخ کے بڑھنے کی وجہ سے تحقیقی سوچ ناپید ہوئی تو وہ ایک ہزار سال کے تاریک دور سے دوچار ہو گئے اور بقول اقبال اس سے وہ اسی صورت نکل سکے جب:

دیکھ چُکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کُہن کے نشاں

حرفِ غلط بن گئی عِصمتِ پیرِ کُنِشت
اور ہُوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں

اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ امت مسلمہ بھی اس وقت اسلام کے تاریک دور (Islamic Dark Ages) سے گزر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دو ارب کے لگ بھگ ہونے کے باوجود کوئی بڑا سائنسدان، بزنس مین، موجد یا قائد پیدا نہیں کر پا رہے۔ یہ سب اسی وقت ختم ہوگا جب ہم بھی اسلام کی اصل تعلیمات کے مطابق توہّمات، مَن گھڑت روایات اور شیخ و پیر کے جھوٹے تقدس کو تج کر تحقیقی سوچ کو حرزِ جاں بنائیں گے۔ ہم اکثر یہ شکایت کرتے ہیں کہ جدیدیت نے امت مسلمہ کو بہت نقصان پہنچایا لیکن یہ بات محض چند مسلم ممالک جیسے ترکی یا ملائیشیا کے بارے میں تو کہی جا سکتی ہے، باقی مسلم دنیا کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح نظر

آتا ہے کہ ان پر جدیدیت سے زیادہ آج بھی قدیمیت کا اثر ہے اور یہ اسی وقت زائل ہوگا جب تحقیقی سوچ پروان چڑھے گی۔

۱۶۔ انقلابی فکر پر اٹھنے والے اعتراضات کا مدلل جواب نہ دے سکنا

دین کی صحیح فکر جو کہ انقلابی فکر ہے اس پر ہر دور میں اعتراضات اٹھتے رہے ہیں اور آج بھی اٹھ رہے ہیں۔ ان کا مدلل جواب نہ دیا جائے تو احیائے اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والے کارکنان کی فعالیت پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ کارکن اس مقصد کے لیے اسی صورت فعال رہ سکتا ہے جب اس کے سامنے یہ واضح رہے کہ یہ جدوجہد اخروی نجات کے لیے لازم وملزوم ہے۔ لیکن جب اعتراض کرنے والے اس کی فرضیت کے بارے میں شکوک و شبہات پید کر دیں تو ان کا جواب دیے بغیر کارکنان کی فعالیت کو برقرار رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال، مولانا مودودی، سید قطب، ڈاکٹر اسرار رحم اللہ علیہم وغیرہم نے اپنے اپنے دور میں ایسے اعتراض کا مدلل جواب دیا لیکن آج جو نئے اعراضات اس پر کھڑے کیے گئے ہیں ان کا مدلل جواب نہیں دیا جا رہا جس کی وجہ سے کارکنان تشکیک کا شکار ہو کر غیر فعال ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ نیز اس جدوجہد میں ہونے والی مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے بھی اس فکر کے خلاف پیدا ہونی والی آوازیں تقویت پکڑ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکوں میں آج متجددانہ رویے پنپ رہے ہیں اور کارکنان متجددین کے افکار سے متاثر ہو رہے ہیں۔ پھر مغرب میں بھی جب سے مابعد جدیدیت کا اثر ورسوخ بڑھا ہے تو خود مغرب میں اور ان کے زیر تسلط پوری دنیا میں ہر قسم کے نظریے کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے اور نسبتی رویے پروان چڑھ رہے ہیں۔ ان رویوں کا عالم اسلام میں ایک بڑا اثر یہ پڑا ہے کہ مذہبی تکثیریت کا فتنہ سر چڑھ کر بول رہا ہے اور اسلامی تحریکوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ ان فتنوں کا ازالہ کیے بغیر اسلامی تحریکوں کو موثر بنانا ممکن نہیں ہے۔

۱۷۔ روایتی طبقے کی مسلسل مخالفت

پوری مسلم دنیا میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ روایت پسند علماء کرام احیائے اسلام کے لیے کی

جانے والی جدوجہد کی سرپرستی کرتے، اس کا ساتھ دیتے لیکن یہ المیہ ہے کہ سوائے الجزائر کے کہیں بھی انھوں نے ان مساعی کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلسل اس کی مخالفت کی اور عوام کو ایسی تحریکوں سے متنفر کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس رویے میں اب بہت حد تک بہتری آچکی ہے لیکن اس منافرت کو اب ختم ہونا چاہیے۔ روایتی طبقے کو چاہیے کہ سقوطِ خلافت کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں ویسے حالات امت میں پہلے کبھی نہ تھے۔ اس لیے ان حالات سے نمبرد آزما ہونے کے لیے دین کی جو ایک نئی تعبیر اسلامی تحریکوں کے بانیان اور عمائدین کی طرف سے سامنے آئی ہے اس کو وہ قدیم روایت کی عینک سے دیکھنے کی بجائے جدید تناظر میں دیکھنا شروع کریں تا کہ علم 'و حرکت' میں یہ 'رقابت' ختم ہو سکے۔

۱۸۔ اسلامی تحریکوں کا اپنے کارکنان کو radicalize ہونے اور terrorism میں پڑنے سے نہ بچا پانا

الحمدللہ پاکستان میں برسرِ پیکار اسلامی احیائی تحریکوں اور تنظیموں نے تو اس مسئلے پر قابو پا لیا ہے لیکن امت مسلمہ میں بالعموم اور عالم عرب میں بالخصوص یہ خطرہ موجود ہے کہ کارکنان مغربی جارحیت کے ردعمل میں شدت پسند رویے اپنا کر دہشت گردی میں ملوث ہو جائیں گے۔ اسلامی تحریکوں کے عمائدین کو اس مسئلے کا ادراک ہونا چاہیے کہ یہ مغربی قوتوں کی امت مسلمہ کے لیے ایک واضح حکمتِ عملی ہے کہ مسلم ممالک کو خانہ جنگی کی دلدل میں دھکیل دیا جائے تا کہ ان کے وسائل سے استفادہ کرنا آسان ہو جائے۔ عراق، شام، لبنان، لیبیا وغیرہ میں تو وہ یہ مقاصد حاصل کر چکے ہیں اور باقی ممالک میں ان کی کاوشیں جاری ہیں۔ اگر وہ کامیاب ہوتے ہیں تو احیائے اسلام کے لیے اب تک کی جانی والی جدوجہد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لیے بہرصورت اسلامی تحریکوں سے منسلک کارکنان کو اس رویے سے اجتناب کرنا ہوگا۔

تفہیم دین ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

عجم ہنوز نداند رموزِ سرمایہ

مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب کی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت وتجارت“ پر تبصرہ

ابتدائیہ

مسلم لیگی علماء مولانا اشرف علی تھانویؒ کے متوسلین بالخصوص مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مفتی محمد شفیعؒ مسلم قوم پرستی کے نقیب رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ان علماء نے تحریکِ احرار کی بھرپور مخالفت کی اور درویشِ خدا مست حضرت امیر شریعت مولانا عطاء اللہ بخاریؒ کو بالکل تنہا چھوڑ دیا۔ تحریکِ احرار برصغیر کی ایک اسلامی انقلابی تحریک تھی جس نے برطانوی سامراج سے مدتوں لڑائی جاری رکھی۔ مسلم لیگی علماء شروع سے اسلامی انقلابی فکر اور عمل کے اصولی مخالف رہے ہیں۔ وہ سامراج سے مصالحت کو ناگزیر تصور کرتے ہیں۔

مسلم قوم پرستی ایک سرمایہ دارانہ نظریہ ہے۔ لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آج حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نظمِ معیشت کو سرمایہ دارانہ قالب میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ علمیت اور عملیت کی مذہبی تشریح مرتب کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ سترہویں صدی میں برطانیہ اور سوئٹزرلینڈ کے پروٹسٹنٹ پادریوں نے سرمایہ داری کی عیسائی تشریح مرتب کی تھی اور اس مہم کی کامیابی کے نتیجہ میں عیسائیت مکمل طور پر سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں ضم ہو گئی۔

ہم اسلامی انقلابی ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام ایک مکمل اور خود منحصر نظامِ زندگی اور طرزِ حیات ہے۔ مغرب جاہلیت خالصہ ہے۔

آج مغرب سے مراد سرمایہ دارانہ نظم اور طرزِ زندگی ہے۔ یہ مغرب بمعنی سرمایہ داری کئی غیر مغربی ممالک چین، بھارت، کوریا، جاپان، اسرائیل، برازیل کو فتح کر چکا ہے اور مسلم دنیا پر حملہ آور ہے۔ اسلامی انقلابی جدوجہد اسی سرمایہ داری حملہ کو ناکام بنانے کی کاوش ہے اور الحمدللہ ہماری جدوجہد بتدریج کامیابیاں حاصل کر رہی ہے۔ دو اسلامی ریاستیں ایران اور

افغانستان وجود میں آ چکی ہیں جہاں سے سرمایہ دارانہ علمیت اور عملیت بے دخل کی جا رہی ہے اور انشاء اللہ جلد ساحلی افریقہ میں دیگر اسلامی ریاستوں کے قیام کی توقع کی جا سکتی ہے۔ عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام شدید ترین بحرانوں (ماحولیاتی، وبائی، مالیاتی، سیاسی، اخلاقی، روحانی اور معاشرتی) کا شکار ہے۔ اور ان شاء اللہ اسلامی انقلابی سرمایہ داری کے گورکن ثابت ہوں گے۔ کیوں کہ ؎

پرچمِ نصرت ہم سے کھلا
رسمِ شجاعت ہم سے چلی

ہم ہیں جوہرِ صبرِ حسینؓ
ہم ہیں زورِ دستِ علیؓ

ہر پل ہر ساعت ایران
جاگ رہا افغانستان

لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان تمام دلائل کا ابطال کریں جو اسلام کو سرمایہ دارانہ نظام میں ضم کرنے کے لیے مسلم لیگی علماء پیش کرتے ہیں۔ مولانا تقی عثمانی کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' میں اسلامی معیشت کو سرمایہ دارانہ نظام میں انضمام کا مقدمہ مرتب کیا گیا ہے۔ پہلے میں مولانا کے استدلال کی تشریح پیش کروں گا اور پھر اس تشریح کے تناظر میں اسلامی انقلابی نقد مرتب کرنے کی کوشش کروں گا۔

اسلام کو سرمایہ دارانہ نظام میں ضم کرنے کے دلائل

مفتی تقی عثمانی جاہلی علمیتِ اکنامکس کو غیر اقداری (value neutral) علمیت تصور کرتے ہیں۔ وہ اشتراکیت (Socialism) کو ایک سرمایہ دارانہ نظریہ تصور نہیں کرتے بلکہ اس کو سرمایہ داری سے جدا ایک معاشی نظم گردانتے ہیں۔ ان کی رائے میں دونوں نظام اسی مفروضہ پر قائم ہیں کہ انسانی خواہشات لامحدود اور معاشی وسائل محدود ہیں۔ مولانا اس مفروضہ کو قبول کرتے ہیں اور اس کو غیر اقداری تصور فرماتے ہیں۔ اور ہر معاشی نظام کا وظیفہ اسی مسئلہ کو حل کرنا گردانتے ہیں۔ ان کی رائے میں وسائل میں لامحدود اضافہ (اس کو وہ ترقی

کہتے ہیں) کرنے کی پیہم جستجو بنیادی معاشی مسائل میں شامل ہے۔

مولانا تقی عثمانی آدم سمتھ کی فکر سے بہت متاثر ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی جو تشریح مولانا پیش کرتے ہیں وہ Smithian ہے، نیو کینز ین یا Institutionalist نہیں ہے۔ آدم سمتھ کی طرح مولانا تقی عثمانی بھی قوانین رسد و طلب (law of supply and demand) کو غیر اقداری اور فطری (law of nature) گردانتے ہیں اور سمتھ کی طرح مولانا کی رائے میں ان فطری قوانین کی عمل داری میں مداخلت نہ کی جائے تو معاشرتی اور معاشی عدل خود بہ خود قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی مولانا سمتھ کے وضع کردہ غائبانہ دست (invisible hand) کی منضبط کارفرمائی کے قائل ہیں اور اس دعویٰ کو قبول کرتے ہیں کہ خود غرضانہ عقلیت (Self Interested Rationality) کی بنیاد پر کیے جانے والے فیصلے خود بخود (spontaneously and automatically) معاشی عدل کو جنم دیتے ہیں۔ یہ بھی اسمتھی مکتب فکر کا بنیادی مفروضہ ہے۔

مولانا اسمتھی تصورِ عملیت پیداوار (factors of productivity) کے بھی قائل ہیں۔ یہاں بھی مولانا تقی کی فکر سمتھی ہے۔ وہ وسائلِ پیداوار کے معاوضے (اجرت، رہن، سود اور منافع) کو طلب اور رسد کے قیمتی توازن (factor price equilibrium) کا نتیجہ تصور کرتے ہیں۔ نظریہ marginal productivity کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مولانا کے پاس "سرمایہ" کا کوئی مربوط تصور موجود نہیں۔ پوری بحث میں طبعی سرمایہ (مشینری، تعمیرات) (Physical Capital) اور فنانشل سرمایہ (Financial Capital) میں آپ کی تفریق مبہم ہے۔

مولانا تقی کی رائے میں سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی ملکیت (Private property) لامحدود فعالیت کی حامل ہے اور اس میں اضافہ (حصولِ منافع کے ذریعہ) اصل محرکِ عمل ہے۔ مولانا کی رائے میں ذاتی ملکیت کی کارفرمائی کی راہ میں حکومتی مداخلت تاریخی طور پر بتدریج رونما ہوئی اور اس قسم کی رکاوٹ ڈالنے سے سرمایہ دارانہ نظم کے اصولوں کی نافرمانی ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک Smithian نظریہ ہے۔

مولانا سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کی جستجو اور قوانین رسد وطلب کی تابع داری کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے احسن تصور کرتے ہیں اور اسلامی معیشت ان معنوں میں سرمایہ دارانہ نظم کی ایک مذہبی تشریح ہے کہ دونوں معیشتوں کے بنیادی کارفرمائی کے اصول یکساں ہیں۔ یہ بات سترہویں صدی میں کیلون اور ڈیکسٹر نے عیسائی معیشت کی سرمایہ کاری کے ضمن میں بھی کہی تھی لیکن اسلامی سرمایہ داری رائج شدہ سرمایہ دارانہ نظام میں کچھ اصلاح ترمیم وتحدید کے ذریعے کرے گی (جیسا کہ عیسائی پادریوں نے سترہویں صدی میں کرنے کی کوشش کی تھی)۔ یہ ترمیم وتحدید نظامِ سرمایہ داری کی علمیت کی شریعت کاری سے ممکن ہوگی۔ جس کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ علمیت اسلامی اخلاقی اصولوں کی پابند ہو جائے گی، اجتماعی فلاح فروغ پائے گی۔ لامحدود مسابقت (perfect competition) کو فروغ دیا جائے گا اور ارتکازِ دولت اور احتکار (monopoly) کا رجحان کم ہوگا۔ یہ بھی قوانینِ رسد وطلب کی تابع داری کا ایک نتیجہ ہے کیوں کہ مولانا عثمانی کے مطابق اجارہ داریاں قوانینِ طلب ورسد کی عملیت کو محدود کر دیتی ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں "اسلام کوئی معاشی نظام نہیں" (ص 54) یعنی وہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک اخلاقی تشریح ہے۔ اسلام قوانینِ رسد وطلب کی تابع داری کو قبول کرتا ہے۔ طلب ورسد کا نظام قدرتی ہے۔ قیمتیں فطری طور پر متعین ہوتی ہیں۔ وہ ذاتی منافع کے دائمی معاشرتی تسلط کو بھی اسلامی تسلیم کرتے ہیں گو کہ منافع کی فطری اور مستقل جستجو پر کچھ شرعی، ریاستی اور اخلاقی پابندیاں عائد کرنا اصلاحِ سرمایہ داری کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن اخلاقی پابندیاں رضا کارانہ طور پر افراد اپنے اوپر خود عائد کرتے ہیں اور معاشی تحکم کے ضمن میں ان کی تنفیذ لازماً ثانوی ہی رہے گی۔ یہ بات بعد کی بحثوں (بالخصوص نظام پیداوار، اسٹاک مارکیٹ اور بینکنگ) کے عمل کے تجزیہ سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ مولانا کی رائے میں اسلامی اور غیر اسلامی معاشروں میں اخلاقیات کا اثر معاشی عمل پر بنیادی طور پر یکساں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلامی اخلاقیات معاشی عمل کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔ یہی دعویٰ سترہویں صدی کے عیسائی پادریوں کا بھی تھا کہ عیسائی اخلاقیات humanitarian ethics کی ایسی مذہبی تشریح ہے جو معاشرتی عمل کے تعین میں زیادہ موثر ہے۔

مولانا کی رائے میں اسلامی تعلیمات اور مروجہ سرمایہ داری میں صرف دو بنیادی فرق ہیں۔ایک یہ کہ سرمایہ (جس کی کوئی واضح تعریف اس کتاب میں نہیں ملتی) آجر اور اجرتی میں تفریق نہیں کرتا اور دوسرا یہ کہ اسلام دولت میں ان لوگوں کا حصہ بھی تسلیم کرتا ہے جو پیداواری یا سرمایہ کے گردشی عمل میں بلاواسطہ شامل نہیں ہوتے۔یہ دونوں فرق غیر اہم ہیں کیوں کہ آجر اور سرمایہ کار کا اختلاف عملاً مینجمنٹ اور ملکیت میں فرق کی بنیاد پر ہوتا ہے اور مولانا کارپوریشن، سٹہ بازی اور بینکنگ کے تجزیہ میں مینجمنٹ اور ملکیت (ownership) کی علیحدگی (separation) کو جائز تصور کرتے ہیں۔اس سے آپ کا یہ دعویٰ کہ اسلام آجر اور سرمایہ کے مالک میں تفریق نہیں کرتا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

رہا دولت کی تقسیم میں محرومین کے حصہ والا فرق تو آج کل ہر سرمایہ دارانہ مالک ہمیشہ سے محرومین کی کفالت کی فراہمی کا کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کرتا ہے۔اٹھارہویں صدی سے ہی یورپی ممالک میں Poor Laws کی تنفیذ ہوگئی تھی اور آج تمام ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں نیشنل انشورنس کا نظام قائم ہے اور سرمایہ دارانہ سوشل ڈیموکریٹ جماعتیں سماجی حقوق (social rights) کی پرزور وکالت کر رہی ہیں۔

مولانا کا سرمایہ دارانہ ملکیت کا تصور بھی غیر حقیقی ہے۔مولانا ارتکاز کو سرمایہ دارانہ خود غرضی کا نتیجہ مانتے ہیں جب کہ ارتکازِ دولت اور احتکار بڑھوتریٔ سرمایہ کا لازمی نتیجہ ہیں محض طبقاتی خودغرضیوں کا اظہار نہیں۔سرمایہ دارانہ ملکیت کی تجسیم کارپوریشن ہوتی ہے۔کارپوریشن ایسی قانونی شخصیت ہوتی ہے جس کا مقصد وجود (raison d'être) صرف اور صرف بڑھوتریٔ سرمایہ (capital accumulation) قرار دیا جاتا ہے۔اگر وہ اس لازمی فریضہ کی ادائیگی میں ناکام ہو جائے تو سٹہ مارکیٹ (stock market) اس کو دیوالیہ (bankrupt) کر دیتی ہے۔مولانا کارپوریشن کے وجود کا شرعی جواز فراہم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کمپنی (یعنی کارپوریشن) شرکتِ عنان میں داخل ہے" (ص 122)۔ان کے خیال میں کارپوریشن اور شراکت کی خصوصیت میں فرق زیادہ تر انتظامی نوعیت کا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ شریعت میں شخص قانونی کے نظائر موجود ہیں۔مولانا وقف، بیت المال اور ترکہ کو

کارپوریشن کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ کیا وقف، بیت المال اور ترکہ کی کارفرمائی کا مقصد بڑھوتریٔ سرمایہ برائے بڑھوتریٔ سرمایہ ہوتا ہے؟ یہ سوال مولانا نہیں اٹھاتے۔ محدود ذمہ داری (limited liability) کے تصور کو بھی شرعی جواز فراہم کرتے ہیں۔ وہ کارپوریشن کو اس کے حصہ داروں کا غلام تصور کرتے ہیں، جبکہ اصلاً مفروضہ مالکان کارپوریشن کے غلام ہوتے ہیں۔

مولانا سٹہ بازی (یعنی حصص کے مستقلاً جاری رہنے والے کاروبار) کو بھی شرعاً جائز تسلیم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شیئرز حصص کنندگان کی ملکیت کا ثبوت ہوتے ہیں۔ وہ حصص کی قیمتوں کے تعین کے نظام کو شرعاً درست گردانتے ہیں اور حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ان کارپوریشنوں کے حصص کی خریداری جائز ہے جو سودی کاروبار میں ملوث ہوں بشرطیکہ حصص خریدنے والے اس کارپوریشن کے سودی کاروبار کے خلاف آواز اٹھائیں۔ مولانا کی رائے میں کارپوریشن کا کمایا ہوا وہ سود جو حلال مال میں محفوظ ہو گیا اس سے استفادہ کرنا حصص کنندگان کے لیے شرعاً جائز ہے۔ یہاں بھی مولانا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔

مولانا سٹہ بازی کی نیت سے شیئرز کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سٹہ بازی (speculation) ہر معاشی عمل کا حصہ ہوتی ہے (ص 139)۔ فیوچر ٹریڈنگ کی کچھ اشکال میں مولانا غرر کے وجود کے قائل نہیں۔ ان آراء کے اظہار سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت تھانویؒ کی طرح مولانا عثمانی بھی سرمایہ دارانہ ملکیت کو اسلامی ملکیت کی ہی ایک شکل گردانتے ہیں۔

مولانا کی سرمایہ دارانہ زر کی تشریح بھی نامکمل ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ زر میں demand depositsاور NBFC deposits(M3,M2) کو شامل نہیں کرتے (گو کہ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ بینک زر کی تشکیل میں ایک کردار ادا کرتے ہیں اور اس تشکیلِ زر کو جائز تصور کرتے ہیں)۔ اس طرح آئی ایم ایف (IMF) کے پیدا کردہ زر SDR کو بھی نظرانداز فرماتے ہیں۔ وہ آئی ایم ایف کو عالمی مرکزی بینک (ص 154) کہتے ہیں حقیقت میں جو کسی نہ

کسی حد تک Bank of International Settlements ہے اور عالمی مرکزی بینک کا کردار بڑی حد تک امریکا کا فیڈرل ریزرو بینک انجام دے رہا ہے۔ International Bank for Reconstruction and Development کو ورلڈ بینک کہتے ہیں (ص 157) جب کہ ورلڈ بینک تین بینکوں (آئی بی آر ڈی، آئی ڈی اے اور آئی ایف سی) کا مجموعہ ہے۔

مولانا کا اصل موضوع اسلامی بینک کاری ہے۔ وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ تاریخی طور پر بینک سرمایہ دارانہ نظام کی ایجاد ہیں اور کسی غیر سرمایہ دارانہ معاشرت میں بینکوں کا وجود نہیں ملتا۔ مسلم ممالک میں سب سے پہلے بینک سامراج نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں قائم کئے۔ وہ اس بات کا اقرار نہیں کرتے کہ بینکوں کا اصل وظیفہ دولت کو زرکی مارکیٹ کے ذریعہ سرمایہ کی گردش میں سمونا ہے۔ زرکی مارکیٹ کی کارفرمائی کی کوئی تفصیل مولانا کی کتاب میں نہیں ملتی۔ اس امر کا بھی اقرار موجود نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مرکزی بینک لازماً کمرشل بینکوں کا ماتحت آلۂ کار رہوتا ہے۔

مولانا کی اسلامی بینک کاری کی وکالت مشہور ہے اور اس پر مفصل نقد علماء دیوبند اور مولانا سلیم اللہ خان نے 2009ء میں مرتب فرما دیا ہے (جس کی اجمالی تصویر ہماری کتاب Money and Banking in Pakistan میں پیش کی گئی ہے)۔ مختصراً یہ کہنا درست ہے کہ حضرت مولانا تقی عثمانی سرمایہ دارانہ بینک کاری کی اسلام کاری کے ملک پاکستان میں اہم ترین داعی اور وکیل ہیں۔

مولانا کی رائے میں بینکوں کا یہ کام ضروری ہے کہ وہ عوام کی بچتوں کو سرمایہ کے گردشی چکر میں سموتے چلے جاتے ہیں (ص 209)۔

وہ Daily Product Basis نظام کے جاری رہنے کی وکالت کرتے ہیں اور نتیجتاً بچت کنندگان کے بینک کے حاصل شدہ منافع میں حقیقی شرکت کی ضرورت کو بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ اوسطی تقسیم کو بھی کافی سمجھتے ہیں (ص 214)۔ یہ سود کو جائز قرار دینے کے حیلے ہیں۔

اس قسم کے حیلوں کی بنیاد پر وہ اسلامی طریقہ ہائے تمویل شرکت اور مضاربت، مرابحہ وغیرہ کو سرمایہ دارانہ قالب میں ڈھالنے کی وکالت کرتے ہیں جن کی حقیقت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ میں تفصیل سے بیان کردی گئی ہے۔

کتاب میں ملکی معاشی پالیسیوں fiscal policy اور monetary policy کی تفصیلی بحث نہیں ملتی ہے۔ مثلاً یہ سوال نہیں اٹھایا گیا کہ کیا ایک اسلامی ریاست میں مرکزی بینک کا وجود ضروری ہے (ہماری تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی) اور اگر ضروری ہے تو مرکزی بینک کیا کردار ادا کرے گا؟ یہ اسلامی مرکزی بینک بین الاقوامی مالی نظام سے کس نوعیت کا تعلق رکھے گا۔ زر کی مقدار اور تقسیم کے تعین کا کیا طریقہ ہوگا۔ بینک ریٹ کا کیا متبادل رائج کیا جائے گا اور کسی متبادل کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟

حکومتی بجٹی خسارہ کی تمویل کے لیے جو تجویز دی گئی ہیں وہ بھی ایک شرعی حیلہ پر مبنی ہے یعنی سود کے بجائے وقتاً فوقتاً انعام جاری کیے جائیں گے اور ٹیکس میں رعایت دے دی جائے گی لیکن چونکہ عوام پر حکومت کا کوئی رہن نہیں اس لیے یہ سود میں داخل نہ ہوگی (ص 266)۔ حکومتی خسارہ کی تمویل کے لیے مضاربہ سرٹیفکیٹ کے اجرا کی تجویز ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ مروجہ ٹریژری بل کے مماثل ہوں گے ان پر جو سود دیا جائے گا وہ منافع کہلائے گا جس طرح آج کل بینک سیونگ اکاؤنٹ پر منافع دیتے ہیں۔

آخر میں (ص 266، 269) مولانا حکومتی بیرونی قرضوں کی تمویل کے لیے اسلامی طریقہ ہائے تمویل کی تجویز دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ طرائق عالمی سرمایہ دارانہ مارکیٹوں میں مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ آئی ایف سی ان کا مداح ہے اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک میں ان پر تحقیق ہو رہی ہے (ص 210)۔ ان طریقہ ہائے تمویل کو استعمال کر کے پاکستان عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں مکمل انضمام حاصل کر لے گا۔

صحیح اسلامی موقف

ہم اس مسلم لیگی ترمیمی (Revisionist) فکر کو کلیتاً رد کرتے ہیں۔ اس تردید کی وجوہات ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ ہم سرمایہ داری کو ایک مکمل نظامِ حیات اور طرزِ زندگی گردانتے ہیں جو ایک مخصوص انفرادیت، معاشرت اور ریاست قائم کرتا ہے۔ سرمایہ داری محض ایک معاشی تنظیم اور طریقہ کار نہیں بلکہ دورِ حاضر کا غالب طاغوت ہے جو موجودہ جہادِ اسلامی کا اصل ہدف ہے۔ ہم سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی اور طرزِ حیات کو معطل اور منتشر کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

۲۔ سرمایہ کوئی طبعی شے نہیں بلکہ حرص اور ہوس کی خبیث پلید روح ہے جو نفوس، دولت ومعاشرت اور ریاستی نظام میں حلول کر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد مارماڈیوک پکتھال رحمۃ اللہ علیہ نے سرمایہ کو تکاثر سے تشبیہ دی ہے اور ان کے مطابق سرمایہ سے مراد حسد اور حرص ہے۔ اسلامی انقلابی عمل کا ایک وظیفہ دولت کو سرمایہ کی گرفت سے نجات دلانا ہے۔

۳۔ سرمایہ دارانہ علمیت اور عمل نفس پرستی کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ وہ انسان کو خود تخلیقی گردانتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کا بنیادی عقیدہ ہے اور تمام سرمایہ دارانہ نظریات (لبرل ازم اور قوم پرستی، اشتراکیت اور انارکزم) اس بنیادی عقیدہ کو قبول کرتے ہیں (اسی لیے ہم اشتراکیت کو ایک سرمایہ دارانہ نظریہ کہتے ہیں۔ یہ کوئی غیر سرمایہ دارانہ نظامِ حیات اور طرزِ زندگی نہیں)۔

۴۔ ہم اکنامکس کو ایک جاہلی علمیت گردانتے ہیں اور اس کے مابعدالطبیعیاتی مفروضات کو باطل کہتے ہیں۔ اکنامکس کا یہ مفروضہ بالکل غلط ہے کہ فطرتاً انسان کی خواہشات لامحدود ہیں۔ خواہشات کو لامحدود بنانا سرمایہ دارانہ نظم زندگی اختیار کرنے کا نتیجہ ہے اور بڑھوتریٔ سرمایہ کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ضروریات نہایت محدود تھیں اور مذاہبِ عالم تاریخ کے ہر دور میں خواہشات اور ضروریات کو محدود کرنے کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ آج خود مغرب میں ڈی گروتھ (de growth) کا نظریہ عام ہو رہا ہے اور خواہشات کو محدود کرنے کی ضرورت کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ ضروریات کو لامحدود تصور کرنا سرمایہ دارانہ معاشرت کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔ ترقی بھی ایک سرمایہ دارانہ تصور ہے جس سے مراد سرمایہ میں مستقل بڑھوتری کو جاری رکھنا ہے۔ ترقی بھی سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیت ہے۔ کسی غیر سرمایہ دارانہ نظام میں ترقی کو معاشی عمل کا ہدف

نہیں گردانا گیا۔

۵۔ اسی طرح قوانینِ رسد و طلب سرمایہ دارانہ فکر کی ایجاد اور سرمایہ دارانہ طرزِ معاشرت سے مخصوص ہیں۔ کسی غیر سرمایہ دارانہ معاشرہ میں یہ "قوانین" کارفرما نہیں ہوتے۔ یہ بات تحقیقات سے ثابت کی گئی کہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں قیمتیں اخلاقی معیارات کی بنیاد پر متعین کی جاتی تھیں اور ان قیمتوں میں اضافہ نہایت محدود ہوتا تھا۔ صدیوں تک قیمتوں کی رفتارِ نمو نہایت کم رہی ہے۔ اسی وجہ سے عادلانہ قیمت کا تصور مقبولِ عام رہا ہے۔ قیمتوں کا مارکٹی تعین صرف ان معاشروں میں عادلانہ قیمتوں کے قیام کا ذریعہ ہوسکتا ہے جہاں لین دین خدا پرستی اور خدا شناسی ہو۔ جن معاشروں میں سرمایہ دارانہ انفرادیت کا غلبہ ہو وہاں قیمتوں کا آزادانہ تعین لازماً ایک ظالمانہ عمل ہے۔

۶۔ سرمایہ دارانہ انفرادیت جس کی تشریح آدم سمتھ کی فکر میں ملتی ہے فطری نہیں نہایت غیر فطری ہے۔ انسان ہیومن بی اِنگ نہیں۔ سرمایہ داری انسان کو ہیومن بی اِنگ (حرص اور ہوس سے مغلوب انفرادیت) میں تبدیل کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ مارکیٹ میں جو دستِ غائبانہ کارفرما ہوتا ہے وہ حرص و ہوس کے شیاطین کا دستِ خبیث ہے اور اس دستِ خبیث کی پشتیبانی سرمایہ دارانہ ریاست اپنی پوری تاریخ میں کرتی رہی ہے۔

۷۔ عواملِ پیداوار (factors of production) کا معاوضہ سرمایہ دارانہ مارکیٹ میں ان عوامل کی سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل میں شرکت کی بنیاد پر متعین ہوتا ہے، رسد اور طلب کے توازنی عمل کے ذریعہ سے متعین نہیں ہوتا ہے۔ یہ بات نظریہ marginal productiсity سے ماخوذ ہے۔ یہ توازن عملاً سرمایہ دارانہ مارکیٹوں میں کبھی قائم نہیں ہوتا اور قیمتوں کا نظام ہمیشہ متزلزل رہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ مارکیٹوں کا مقصد وجود بڑھوتریٔ سرمایہ برائے بڑھوتریٔ سرمایہ ہے لہٰذا عواملِ پیداوار کا معاوضہ لازماً اسی بنیاد پر متعین کیا جاتا ہے کہ وہ سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل کو جاری رکھنے میں کتنے معاون ہیں۔ نجی ملکیت کو تباہ کر دیا جاتا ہے۔ نجی ملکیت کی تباہی کا یہ عمل کارپوریشن کے قیام کے ذریعہ عمل میں لایا جاتا ہے۔ کارپوریشن وہ شخصِ قانونی ہے جس کا وجہ الوجود بڑھوتریٔ سرمایہ برائے بڑھوتریٔ سرمایہ ہوتا

ہے۔ ان معنوں میں کارپوریشن کا اصل مالک خود سرمایہ ہوتا ہے اور اس مالک کے خدمت گار وہ منیجر ہوتے ہیں جو سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل کو جاری رکھنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ کارپوریشن کے حصص داران کی ملکیت محض فرضی اور افسانوی ہوتی ہے۔ وہ بڑھوتریٔ سرمایہ کے عمل میں رخنہ ڈالنے کا حق نہیں رکھتے۔ محض اس چیز کی نگرانی کرتے ہیں کہ سرمایہ کے خادم (منیجر) اس کی مستقل بڑھوتری کا عمل تندہی سے جاری رکھے ہوئے ہیں یا نہیں۔

۸۔ بینک بھی ایک سرمایہ دارانہ ایجاد ہیں۔ کسی غیر سرمایہ دارانہ نظام میں بینکوں کا وجود ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں کا وجہ الوجود سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل کو مہمیز دینا ہے۔ وہ پورے معاشرے کی بچتوں کو کھینچ کھینچ کر سرمایہ کے گردشی چکر میں شامل کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ذاتی ملکیت کو ختم کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ یوں عوام اپنی بچتوں کے استعمال کے حق سے محروم کر دیئے جاتے ہیں اور تمام دولت پر سرمایہ دارانہ تعامل (یعنی حرص و ہوس) کا فتنہ مسلط ہو جاتا ہے۔

۹۔ سرمایہ دارانہ مارکیٹوں میں قوانینِ رسد وطلب کی کارفرمائی لازماً اجارہ داری کو جنم دیتی ہے۔ خالص مسابقت خود بخود اجارہ داریاں پیدا کرتی ہے اور آج ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ معیشتوں میں خالص مسابقت کا وجود بالکل ختم ہو گیا ہے اور ترقی پذیر سرمایہ دارانہ ممالک میں تیزی سے ختم کیا جا رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظاماتی تناظر میں اجارہ دارانہ مارکیٹوں کا انہدام ناممکن ہے۔ یہ بات فنانشل مارکیٹوں کے ضمن میں سب سے زیادہ واضح ہے۔

۱۰۔ فنانشل مارکیٹ یعنی سود کی مارکیٹ اور سٹہ کی مارکیٹ بھی خالص سرمایہ دارانہ ادارے ہیں جن کا کسی غیر سرمایہ دارانہ معاشرت میں کوئی وجود ممکن نہیں۔ یہ ارتکاز و بڑھوتریٔ سرمایہ کے اصل دائرہ کار ہیں۔ ان کی کارفرمائی کے ذریعے ہر شے اور عمل کی قدر اس کی سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل میں شرکت کی بنیاد پر متعین ہوتی ہے۔ اس عمل کو سیکورٹائزیشن کہتے ہیں اور سیکورٹائزیشن کے ذریعہ سرمایہ دارانہ تعقل کی بنیاد پر ہر شے کی قیمت متعین کی جاتی ہے۔ معاشرتی سطح پر سرمایہ دارانہ اقدار کا غلبہ سیکورٹائزیشن کے ذریعے سے نظام زندگی پر مسلط کیا جاتا ہے۔

۱۱۔ سرمایہ کی اصل نمائندہ قوت ریاست ہے۔تاریخی طور پر یہ بات واضح ہے کہ سرمایہ دارانہ ریاست کے توسط سے ہی سرمایہ دارانہ انفرادیت اورسرمایہ دارانہ معاشرت مذہبی انفرادیت پر غالب آئی۔سرمایہ دارانہ ریاست کے غلبہ کے بغیر تحکم قانونِ سرمایہ اورسرمایہ دارانہ ملکیت قائم نہیں کی جاسکتی۔

ان نکات سے واضح ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی اسلام کاری ایک فعلِ عبث ہے۔اسلام بڑھوتریٔ سرمایہ کے عمل کوان معنوں میں رد کرتا ہے کہ وہ دولت پرسرمایہ(حرص وہوس) کے قبضہ کے خلاف ہے۔ وہ معاش کو معاد میں حصولِ فلاح کا ذریعہ گردانتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں شرعِ مطہرہ قوانینِ رسد وطلب کی محض تحدید نہیں کرتی ان کومعدوم کر کے معاشی عمل کواسلامی اقدار کے ماتحت بناتی ہے۔ضروریات اورخواہشات کومحدود کرتی ہے۔سوداورسٹہ کا نعم البدل وضع نہیں کرتی۔سود خوری اور سٹہ بازی کو ناممکن بناتی ہے۔ اسلامی ریاست کی پالیسیاں (مالی،تمویلی،تجارتی،منصوبہ ساز) ایک جہادی معیشت تعمیر کرتی ہیں۔ اسلامی ریاست سرمایہ داری سے مصالحت نہیں کرتی۔سرمایہ دارانہ علمیت اورمعاشرتی صف بندی کورد کرتی ہے۔ وہ سامراجی تسلط کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکتی بلکہ سامراج کے انہدام کا عزم کرتی ہے۔مسلم لیگی علماءسرمایہ داری سے مصالحت کے خواہاں ہیں۔وہ ایک جہادی اسلامی ریاست کے قیام کوناممکن تصور کرتے ہیں۔

ہم اسلامی انقلابی ہیں اوراسلامی امارت افغانستان میں ایک جہادی معیشت کے قیام کی کوشش کی جارہی ہے۔ وہاں نہ سود کی مارکیٹ موجود ہے نہ سٹہ کی۔ وہاں سرمایہ دارانہ مارکیٹ کے بجائے اسلامی ملکیت کوفروغ دیا جارہا ہے۔ وہاں عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں انضمام کی راہیں مسدود کردی گئی ہیں اوراس نے دوسال کے قلیل عرصہ میں معاشی استحکام اور عدلِ اجتماعی قائم کردیا ہے۔

جوانو قابلِ تقلید ہے اقدام طالب کا
جبینِ لوحِ غیرت پر لکھا ہے نام طالب کا

حقیقت یہ ہے کہ مولانا تقی عثمانی سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو بالکل نہیں جانتے۔

تفہیم دین مولانا زاہد الراشدی

فکرِ شیخ الہندؒ کے عصری تقاضے

(بزم شیخ الہندؒ کے زیرِ اہتمام 30 نومبر 2023ء کو گوجرانوالہ میں منعقدہ شیخ الہندؒ سیمینار سے حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب کا خطاب جسے حافظ خرم شہزاد نے تحریر کیا۔)

بعد الحمد والصلوٰۃ!

بزمِ شیخ الہندؒ اور جمعیۃ طلباء اسلام ضلع گوجرانوالہ کا شکرگزار ہوں کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ العزیز کو ہمیں ایسے وقت میں دوبارہ یاد دلایا کہ جس وقت پوری دنیائے اسلام میں ان کے مشن، وژن اور طریقہ کار کو اپنانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

حضرت مولانا عبد القیوم حقانی، پروفیسر ڈاکٹر امجد علی شاکر، مولانا حافظ غضنفر عزیز اور تمام مہمانوں کا شکرگزار ہوں کہ وہ تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کی جدوجہد کے حوالے سے مختلف پہلوؤں پر اپنے مطالعہ، تحقیق اور تجزیہ کا ماحصل پیش کیا۔

شیخ الہندؒ نے مالٹا سے واپسی کے بعد جو کام کیے تھے مَیں ان کو مختصراً پانچ نمبروں میں بیان کروں گا۔

۱۔ ان کا پہلا کام تو آزادی کی جدوجہد تھا۔ ان کی ساری زندگی بیرونی مداخلت کاروں، بیرونی آقاؤں، ان کے نظام اور بیرونی نوآبادیاتی سسٹم سے ملک کو آزاد کرانے سے عبارت تھی۔ یہ ان کا بنیادی مقصد تھا۔ ملک کو آزاد کرانا، قومی خودمختاری حاصل کرنا اور غیر ملکی دخل اندازی کو روکنا۔

مَیں پوچھنا چاہوں گا کہ کیا یہ مقصد ہمیں حاصل ہو گیا ہے؟ یہ مقصد پورا ہو گیا ہے یا ابھی ادھورا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی آزادی ہماری ضرورت ہے۔ نوآبادیاتی نظام سے آزادی، بیرونی مداخلت سے آزادی اور قومی خودمختاری۔ آج بھی اسی طرح یہ ہماری ضرورت ہیں جس طرح شیخ الہند کے زمانے میں تھیں۔

۲۔ دوسری بات حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی تحریک میں جسے 'تحریک ریشمی رومال' کہتے ہیں اور جس کو برٹش استعمار کے کاغذات میں ریشمی خطوط سازش کیس اور جرمن سی آئی ڈی 'برلن پلان' کہتی ہے، انہوں نے اس کا ہدف متعین کیا اور وہ تھا حکومتِ الٰہیہ۔ یہ قومی، ملی اور دینی تحریک تھی۔ اس میں انہوں نے آزادی کا مقصد اور جدوجہد کا تعین کیا۔ یہ نعرہ نہیں تھا کتاب اور پورا دستور ہے کہ جب ہم آئیں گے تو حکومت الٰہیہ ہوگی اور اس کا دستور یہ ہوگا۔ آج تک کتاب تو موجود ہے باقی باتیں ہم بھول گئے ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آزادی اور آزادی کے بعد حکومتِ الٰہیہ ہمیں حاصل ہوگئی ہے؟ آسمانی تعلیمات کی علمبرداری ہمیں مل گئی ہے اور کیا شریعت کا نفاذ ہو گیا ہے؟

۳۔ ایک دور تھا مسلح جدوجہد کا، حضرت شیخ الہندؒ نے کہا کہ اب ہم مسلح جدوجہد نہیں کریں گے بلکہ سیاسی جدوجہد کریں گے۔ ہتھیار اٹھائے بغیر جنگ کریں گے اور جنگ کی بھی گئی۔ اُن کے اس وژن پر ملک میں سب سے پہلی تحریک کلکتہ سے پشاور تک 'تحریکِ خلافت' کے نام سے منظم ہوئی اور یہ ایک پُرامن تحریک تھی۔ پورے برصغیر میں لوگ سڑکوں پر تھے اور اسٹریٹ پاور پوری قوت کے ساتھ میدان میں تھی۔ آج وہ اسٹریٹ پاور ہم سے گم ہوگئی ہے۔

۴۔ شیخ الہندؒ نے چوتھا کام یہ کیا کہ دونوں قیادتوں کو اکٹھا کیا تھا تمام تر اختلافات کے باوجود۔ دیوبند اور علی گڑھ کو ایک اسٹیج پر جمع کیا تھا۔ اور شیخ الہندؒ کے بعد جتنی تحریکیں چلی ہیں ان میں سب علماء اور علی گڑھ والے اکٹھے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر یہ دیوبند کے فارغ التحصیل نہیں تھے، مولانا شوکت علی کسی مدرسے کے فارغ نہیں تھے۔ مولانا ظفر علی خان علی گڑھ کے فاضل اور علیگ تھے۔ لیکن مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان کو مولانا کا ٹائٹل حضرت شیخ الہندؒ نے دیا تھا۔

درمیان میں ایک لطیفہ سناتا جاؤں کہ وزیر آباد جو مولانا ظفر علی خان کا شہر بھی ہے، پچھلے سال وہاں ایک سیمینار تھا میں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم بڑے تنگ دل ہیں یہ دوسروں کو برداشت نہیں کرتے۔ آپ نے مولانا ظفر علی خان کو علی گڑھ بھیجا تھا مسٹر بننے کے لیے، ہم نے مولانا بنا کر آپ کو واپس کر دیا۔ ہم سے زیادہ فراخ دل کون ہوگا؟ یہ بات درمیان میں

چھوڑتے ہوئے عرض کروں گا کہ حضرت شیخ الہند نے دونوں قیادتوں کو اکٹھا کیا تھا۔کیا آج دونوں قیادتیں اکٹھی ہیں؟

(5) پانچویں اور آخری بات، انہوں نے کہا آپس کے جھگڑے چھوڑ کر قرآن پاک اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف واپس آجاؤ۔

حضرت شیخ الہند کی تحریک کے یہ پانچ نکات ہیں؛ آزادیٔ کامل، حکومتِ الٰہیہ، غیر مسلح جدوجہد، قدیم اور جدید کا اتحاد اور قرآنی تعلیمات کی طرف واپسی۔ یہ ان کی جدوجہد کے پانچ نکات ہیں۔

ہم آج بھی اسی طرح کھڑے ہیں جیسے ان کے زمانے میں تھے اور جو جدوجہد انہوں نے کی ہماری محبت اور عقیدت ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ انہی پانچ نکات کے لیے محنت کریں، قومی آزادی کے لیے محنت کریں۔ انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی اور برٹش استعمار کے خلاف کی تھی اور آج ہماری جدوجہد آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور امریکا کے خلاف ہوگی۔ ان کو ایسٹ انڈیا کمپنی نچوڑ رہی تھی اور ہمیں آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور عالمی مالیاتی ادارے نچوڑ رہے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے دونوں قیادتوں کو اکٹھا کیا تھا مگر آج ہم نے الگ الگ جھنڈے سنبھالے ہوئے ہیں لہٰذا اکٹھا ہونا ہوگا اور قرآن پاک اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف واپس آنا ہوگا۔ حکومتِ الٰہیہ کو اپنا ٹارگٹ بنانا ہوگا۔

یہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کا پانچ نکات کی شکل میں خلاصہ عرض کیا ہے۔ اللہ پاک ہمیں ان کی یاد منانے کے ساتھ ساتھ ان کے نقش قدم پر چلنے کی، ان کے وژن اور جدوجہد کو اپنانے کی کی توفیق عطا فرمائے۔

بقیہ: خطوط

البرہان

مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے کہ ایک اصلاحی تحریک منظم کیے بغیر چارہ نہیں لیکن میرے اور آپ جیسے ''بزرگ'' تو محض سوچ سکتے ہیں یا لکھ سکتے ہیں۔ اس تحریک کو برپا کرنے کے لیے نوجوان قیادت کی ضرورت ہے۔

شاہنواز فاروقی

تفہیمِ مغرب

مغرب کے غلبے کے اسباب کیا ہیں؟

[دیکھیے اس مضمون پر مدیر کا تبصرہ، مضمون کے آخر میں]

ہماری دنیا دوسو سال سے مغرب کی دنیا ہے۔اس کا آسمان اور زمین مغرب کی ہے۔اس کے سورج، چاند اور ستارے مغرب کے ہیں۔اس کی ہوا اور فضا مغرب کی ہے۔اس کے خیر وشر مغرب کے ہیں۔سوال یہ ہے کہ آخر مغرب کے اس ہمہ گیر، ہمہ جہتی اور ہولناک غلبے کے اسباب کیا ہیں؟

جہاں تک مسلم دنیا کا تعلق ہے تو مسلم دنیا پر مغرب کے غلبے کی ایک بہت بڑی وجہ اقبال کے اس شعر میں موجود ہے ۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مسلمان کہنے کو خدا کو مانتے ہیں۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت کرتے ہیں۔ وہ قرآن کو سینے سے لگاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت نے اپنے نفس کی خواہشوں کو اپنا خدا بنالیا ہے۔ کروڑوں مسلمان ہیں جن کی زندگی ''خدا مرکز'' اور ''رسول مرکز'' ہونے کی بجائے ''دولت مرکز'' اور ''طاقت مرکز'' ہے۔مسلمان کہنے کو ایک ارب 80 کروڑ ہیں مگر ان کا اخلاقی اور علمی وزن ایک کروڑ مسلمانوں کے برابر بھی نہیں۔ اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اقبال نے ایک صدی پہلے کہا تھا:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب تک مسلمانوں کی زندگی خدا مرکز، رسول مرکز اور کتاب مرکز تھی ، انہوں نے بہت تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ غزوہ ٔ بدر میں 313 مسلمانوں نے ایک ہزار کے لشکر کو شکست فاش سے دوچار کیا۔ بعد کے زمانے بھی مسلمانوں کے کارناموں سے بھرے ہوئے ہیں۔ طارق بن

زیادا سپین فتح کرنے نکلے تو ان کے پاس صرف 17 ہزار فوجی تھے اور ان کے مقابل ایک لاکھ کا لشکر تھا مگر مسلمانوں نے ایک لاکھ کے لشکر کو شکست دی۔ محمد بن قاسم سندھ فتح کرنے آئے تو ان کے پاس صرف 18 ہزار فوجی تھے اور راجا داہر ایک لاکھ کا لشکر لیے کھڑا تھا مگر محمد بن قاسم کے 18 ہزار فوجیوں نے ایک لاکھ کے لشکر کو زیر کرلیا۔ 20 ویں صدی میں مٹھی بھر افغان مجاہدین نے وقت کی ایک نہیں دو سپر پاورز کو شکست سے دو چار کیا لیکن مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا ایمان کمزور ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلم دنیا کے بادشاہ، جرنیل اور سیاسی حکمران امریکا کو ایک ملک نہیں ایک خدا سمجھتے ہیں۔ نائن الیون کے بعد جنرل پرویز مشرف نے ایک ٹیلی فون کال پر پورا پاکستان امریکا کے حوالے کردیا۔ آج اسرائیل غزہ میں انسانی تاریخ کا ایک بڑا ظلم کررہا ہے مگر مسلم دنیا کے حکمران اسرائیل اور اس کے پشت پناہ امریکا اور یورپ کی مذمت تک کرنے کے لیے تیار نہیں۔

انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسانوں کی عظیم اکثریت حق و باطل اور غلط اور صحیح کو نہیں دیکھتی وہ طاقت اور اس کے توازن کو دیکھتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سردار انبیا تھے، خاتم النبیین تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ بے مثال تھی، مگر اس کے باوجود مکے کی 13 سالہ زندگی میں مکے کے اکثر لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے سے انکار کردیا۔ لیکن جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ فتح کرلیا اور سیاسی و معاشی طاقت حاصل کرلی تو دیکھتے ہی دیکھتے پورا عالمِ عرب مسلمان ہوگیا۔ امام حسینؓ حق پر تھے، اہل کوفہ نے آپ کو خط لکھ کر خود کوفہ بلایا تھا مگر امام حسینؓ جب کوفہ پہنچے تو اہل کوفہ یزید کی طاقت سے خوف زدہ ہوگئے اور انہوں نے امام حسینؓ کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کربلا میں پورا خانوادہء رسول شہید کردیا گیا لیکن یزید کے خلاف کوئی عوامی بغاوت نہیں ہوئی۔ کوئی اس کی طاقت کو چیلنج کرنے کے لیے نہ نکلا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانوں کی اکثریت کے لیے دعویٰ جھوٹا ہوتا ہے اور قبضہ سچا ہوتا ہے۔

آج مسلم دنیا کے بڑے بڑے ملکوں پر ان ملکوں کے جرنیلوں اور افواج کا غلبہ ہے اور اس غلبے کو کوئی چیلنج کرنے کے لیے تیار نہیں۔ عملی مزاحمت تو دور کی بات کوئی جرنیلوں اور مسلم دنیا کی افواج پر تنقید تک کے لیے آمادہ نہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو مغرب کی طاقت

بے مثال ہے۔اس کے پاس سیاسی طاقت ہے،عسکری طاقت ہے،معاشی طاقت ہے،ابلاغی طاقت ہے۔ اس طاقت سے مسلمانوں سمیت پوری دنیا خوف زدہ ہے۔ بلاشبہ قوم پرست چین امریکا کی مزاحمت کر رہا ہے مگر وہ بھی امریکا کے ساتھ تصادم نہیں چاہتا۔

امریکا اور یورپ تو بڑی چیز ہیں، کراچی میں 30 سال تک الطاف حسین اور ایم کیو ایم کی طاقت کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔لوگ گھروں میں بھی الطاف حسین اور ایم کیو ایم پر تنقید کرتے تھے تو احتیاطاً گھر کے دروازے بند کر لیتے تھے۔ الطاف حسین کے ایک اشارے پر پورا شہر بند ہو جاتا تھا۔35 سال تک پاکستان کے اخبارات میں الطاف حسین کے خلاف ایک لفظ نہیں چھپ سکا۔صرف روزنامہ جسارت اور ہفت روزہ تکبیر میں الطاف حسین پر تنقید شائع ہوتی تھی۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر ایک فرد اور ایک تنظیم کی طاقت اتنی ہے تو مغرب کی طاقت کا دنیا پر کیا رعب اور دبدبہ ہوگا۔

بدقسمتی سے مغرب کی مادی ترقی کی وجہ سے پوری دنیا مغرب کو حیرت اور ہیبت سے دیکھتی ہے۔امریکا نے جاپان پر ایک نہیں دو ایٹم بم گرائے۔اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ جاپانیوں کو امریکا کی ہر چیز سے نفرت ہو جاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔اس کے برعکس جاپان نے امریکا اور یورپ کی ترقی کے ماڈل کو اپنے لیے نمونۂ عمل بنالیا۔اس نے مغرب کا سیاسی ماڈل اختیار کرلیا۔اس نے مغرب کے معاشی اور سیاسی نظام کو کاپی کیا۔چین کمیونسٹ ملک تھا مگر اس نے سرمایہ دارانہ نظام کو اپنے لیے راہ ہدایت سمجھا۔بلاشبہ چین میں مغرب کی جمہوریت نہیں ہے مگر جمہوریت کے سوا چین کی ہر چیز مغرب کی نقل ہے۔اس کا صنعتی اور تجارتی ماڈل مغرب کی عطا ہے۔

دنیا میں مغرب کے غلبے کی ایک وجہ اس کا سیاسی نظام ہے۔ اقبال نے مغرب کی جمہوریت پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا ۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اقبال کہہ رہے تھے مغربی جمہوریت معیاری یا Qualitative نہیں ''مقداری'' یا Quantitative ہے۔

اس نظام میں امام غزالی اور مولانا مودودی کا بھی ایک ووٹ ہے اور میرا اور آپ کا بھی ایک ووٹ ہے۔ جو نظام ''معیار'' کو اس حد تک نظر انداز کرتا ہو وہ کتنا فضول ہوگا مگر مغرب نے جمہوریت کو پوری دنیا کا عشق بنا دیا ہے۔

مسلمان جب سیکڑوں سال تک دنیا کی واحد سپر پاور تھے تو صرف ان کی سیاسی، عسکری اور معاشی طاقت ہی ان کے عالم گیر غلبے کا سبب نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کی ''علمیت'' بھی اس کا سبب تھی۔ مسلمانوں نے بے مثال علمِ تفسیر، بے مثال علمِ حدیث اور بے مثال علمِ فقہ ہی تخلیق نہیں کیا تھا، انھوں نے نیا علمِ تاریخ، داستان کی شاندار روایت، لازوال شاعری اور اپنا فلسفہ پیدا کیا تھا، اپنی حیاتیات، اپنا علمِ طب، اپنی طبیعیات، اپنی ریاضی اور اپنی منطق پیدا کی تھی۔ چنانچہ یہ علوم وفنون بھی دنیا میں مسلمانوں کے غلبے کا سبب تھے۔ آج مغرب کا عالمی غلبہ صرف اس کی سیاسی، عسکری اور معاشی طاقت کا رہینِ منت نہیں بلکہ مغرب کے علوم وفنون بھی اس کا سبب ہیں۔

آج مسلمانوں کے اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں مغرب کے علوم وفنون پڑھائے جارہے ہیں اور ہمارے ذہنوں پر مغربی مفکرین کے افکار کا غلبہ ہے۔ مسلم دنیا میں کہیں بڑی تخلیقی فکر موجود نہیں۔ ہمارے پاس نہ کوئی بڑا شاعر ہے۔ نہ بڑا ادیب ہے۔ نہ بڑا فلسفی ہے، نہ بڑا سائنس دان، نہ کوئی بڑا موجد ہے، یہاں تک کہ اب ہمارے پاس کوئی بڑا عالم دین بھی نہیں ہے۔ پوری مسلم دنیا بونے اور بالشتیے پیدا کرنے میں لگی ہوئی ہے اس صورت حال میں مغرب عالم اسلام پر غالب نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

البرہان

شاہنواز فاروقی صاحب ایک فاضل شخص ہیں۔ انھوں نے مغرب کی سیاسی، عسکری، معاشی، سائنسی اور ٹیکنالوجیکل قوت کو مغرب کے غلبے کا سبب قرار دیا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے کمزور ہونے یا مغرب کے مقابلے میں شکست خوردہ ہونے، اس سے مرعوب ہونے اور اس کی پیروی کرنے کی خواہش کا سبب ان قوتوں سے محروم ہونا ہے۔ یہ تجزیہ بظاہر صحیح لگتا ہے لیکن حقیقتاً جزوی، ناقص اور کسی حد تک Misleading ہے۔ اصل بات جس کا جواب سوچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ مغرب کی اس قوت کا منبع کیا ہے؟ اور مسلمان اگر

آج ان قوتوں سے محروم ہیں تو اس کا بنیادی سبب کیا ہے؟

یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے جس کا جواب ہماری کئی تحریروں اور کتابوں خصوصاً ''مسلم نشأۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل'' میں موجود ہے (ہماری کتابوں کی سافٹ کاپی کے لیے دیکھیے لنک (https://alburhaan.pk)۔خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ترقی اور غلبے کا بنیادی سبب کسی قوم یا معاشرے کی اپنے نظریۂ حیات سے شدید وابستگی ہوتی ہے جس کی وجہ سے فرد میں وہ صلاحیتیں ابھر کر نمایاں ہوجاتی ہیں جو دنیا میں قطعِ اسباب کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ مسلمانوں میں جب تک ان کے دین اور نظریۂ حیات سے یہ حقیقی وابستگی موجود تھی، ان کے افراد میں یہ صلاحیتیں جوبن پر تھیں اور وہ دنیاوی لحاظ سے بھی غالب اور ترقی یافتہ تھے۔ جب ان کے نظامِ تعلیم وتزکیہ میں بگاڑ پیدا ہوا تو اس کے نتیجے میں ایمان میں پختگی پیدا ہونی بند ہوگئی اور اعمالِ صالحہ کا صدور کم ہوگیا۔گویا مسلمانوں میں وہ صلاحیتیں اور قوتیں نہ رہیں جو دنیا میں قطعِ اسباب کے لیے ضروری ہیں۔

اصولی طور پر اس کا حل یہ ہے کہ صحیح نظام تعلیم وتزکیہ کے ذریعہ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ ایسے افراد تیار کیے جائیں جن کا ایمان پختہ ہو، جو اسلام کے ساتھ شدید جذباتی وابستگی رکھتے ہوں، اس کے نتیجے میں لازماً اعمال صالحہ وجود میں آئیں گے اور مسلمانوں میں وہ صلاحیتیں پیدا ہوجائیں گی جو دنیا میں قطعِ اسباب کے لیے ضروری ہیں۔ جب وہ صلاحیتیں ان میں ہوں گی تو منطقی طور پر سیاسی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، سائنسی قوتیں بھی انہیں حاصل ہوجائیں گی جیسا کہ انہیں پچھلے ایک ہزار سال میں حاصل ہوئی تھیں۔لہٰذا اصل چیز یہ ہے کہ نظامِ تعلیم وتزکیہ کی اصلاح سے وہ فرد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو دینِ اسلام سے اسی طرح وابستہ ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو دین سے وابستہ کیا تھا۔ اس طرح کے مزکیٰ افراد پر مبنی معاشرہ اور ریاست مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ کرنٹ دوڑا دے گی جو انہیں دنیا کا امام بنا دے گی۔ اسی لیے امام دار الہجرہ امام مالکؒ نے فرمایا تھا کہ اس قوم کے آخر کی اصلاح بھی اسی طرح ہوسکتی ہے جس طرح ابتداء میں اس کی ہوئی تھی یعنی جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام کی اصلاح وتربیت کی تھی۔اللہ کرے اس مختصر تحریر سے ہمارا مدعا واضح ہوگیا ہو۔

تفہیم مغرب ارسال فرمودہ: کمانڈر محمود اقبال صاحب

ٹیکنالوجی دنیا کو بدل رہی ہے
کیا آپ بھی بدلنے کو تیار ہیں؟

1998ء میں کوڈک میں 1،70،000 ملازمین کام کررہے تھے۔ وہ دنیا میں 85 فیصد فوٹو پیپر فروخت کرتے تھے۔ کچھ سالوں میں ڈیجیٹل فوٹو گرافی نے انہیں بازار سے نکال دیا۔ کوڈک دیوالیہ ہوگیا۔ اس کے تمام ملازمین سڑک پر چلے گئے۔ ان سب کے معیار میں کوئی کمی نہیں تھی۔ پھر بھی وہ مارکیٹ سے باہر۔ وجہ؟ وقت کے ساتھ ساتھ وہ تبدیل نہیں ہوئے۔

آنے والے 10 سالوں میں دنیا پوری طرح سے تبدیل ہو جائے گی۔ آج چلنے والی صنعتوں میں سے 70 سے 90 بند ہوجائیں گی۔ چوتھے صنعتی انقلاب میں خوش آمدید۔ اوبر (Uber) صرف ایک سافٹ ویئر ہے، اپنی ایک بھی کار نہ ہونے کے باوجود وہ دنیا کی سب سے بڑی ٹیکسی کمپنی ہے۔

ایئر بی این بی (Air BNB) دنیا کی سب سے بڑی ہوٹل کمپنی ہے حالانکہ اس کے پاس اپنا کوئی ہوٹل نہیں ہے۔ اب امریکہ میں نوجوان وکلاء کے لئے کوئی کام باقی نہیں ہے کیونکہ آئی بی ایم واٹسن (IBM Watson) سافٹ ویئر ایک لمحے میں بہتر قانونی مشورے دیتا ہے۔ اگلے 10 سالوں میں 90٪ امریکی وکیل بے روزگار ہوجائیں گے۔ جو 10 فیصد بچ جائیں گے وہ سپر ماہر ہوں گے۔

واٹسن نامی سافٹ ویئر انسانوں کے مقابلے میں کینسر کی تشخیص 4 گنا زیادہ درست طریقے سے انجام دیتا ہے۔ 2030ء تک کمپیوٹر انسانوں سے زیادہ ذہین ہوں گے۔ اگلے 10 سالوں میں 90 فیصد کاریں پوری دنیا کی سڑکوں سے غائب ہوجائیں گی۔ جو بچ جائیں گی۔ وہ یا تو الیکٹرک کاریں ہوں گی یا ہائبرڈ۔ سڑکیں خالی ہوں گی۔ پٹرول کی کھپت میں 90 فیصد کمی واقع ہوگی۔ تمام عرب ممالک دیوالیہ ہوجائیں گے۔ آپ کو اوبر جیسے سافٹ ویر سے کار مل

جائے گی۔ کچھ ہی لمحوں میں ڈرائیورلیس گاڑی آپ کے دروازے پر کھڑی ہوگی۔ اگر آپ اسے کسی کے ساتھ شیئر کر لیتے ہیں تو وہ سواری آپ کو موٹر سائیکل سے بھی سستی پڑے گی۔ کاروں کے ڈرائیورلیس (Driverless) ہونے کی وجہ سے 99 فیصد حادثات بند ہو جائیں گے۔ زمین پر ڈرائیور جیسا کوئی روزگار نہیں چھوڑا جائے گا۔ جب 90 فیصد کاریں شہروں اور سڑکوں سے غائب ہو جائیں گی۔ تو ٹریفک اور پارکنگ جیسے مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایک کار 20 کاروں کے برابر ہوگی۔

5 یا 10 سال پہلے ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں پی سی او (PCO) نہ ہو۔ پھر جب موبائل فون سب کی جیب میں آیا۔ تو پی سی او بند ہونا شروع ہو گئے۔ تمام پی سی او والے لوگوں نے فون کا ری چارج بیچنا شروع کر دیا۔ اب یہاں تک کہ ری چارج آن لائن بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ آج کل مارکیٹ میں ہر تیسری دکان پر موبائل فون ہیں۔ فروخت، خدمت، ری چارج، لوازمات، مرمت، بحالی وغیرہ وغیرہ۔

اب اکثر لین دین اے ٹی ایم سے کیا جا رہا ہے۔

اب لوگوں نے اپنے فون سے ہی ریلوے ٹکٹ بک کرنا شروع کر دی ہیں۔

اب پیسوں کا لین دین بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ کرنسی نوٹ کو پہلے پلاسٹک منی نے تبدیل کیا تھا۔ اب یہ ڈیجیٹل ہو گئی ہے۔

دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔

آنکھیں اور کان کھلے رکھیں ورنہ آپ پیچھے رہ جائیں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونے کے لئے تیار رہیں۔ لہٰذا ایک شخص کو چاہیے کہ وہ وقت گزرنے کے ساتھ اپنے کاروبار کی نوعیت کو بھی بدلتا رہے۔ کاروبار کو وقت کے ساتھ ساتھ اپ گریڈ کریں۔ وقت کے ساتھ آگے بڑھیں اور کامیابی حاصل کریں تاکہ اچھا وقت گزاریں۔

خطوط

عمران خان کے نام

بحیثیت ایک پاکستانی میرا تجزیہ یہ ہے کہ پاکستان میں عوام کی حمایت سے حکومت صرف اس وقت بدلی جب سیاسی اور دینی جماعتیں اکٹھی ہوگئیں۔ تحریک انصاف اس وقت اکیلے حکومت اور اسٹیبلشمنٹ سے لڑ رہی ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ فوراً جماعت اسلامی، حنفی دیوبندیوں میں سے جمعیت علماء اسلام نظریاتی (شیرانی گروپ)، حنفی بریلویوں میں سے حامد رضا گروپ، اہلحدیث حضرات میں سے علامہ ابتسام الٰہی ظہیر اور اہل تشیع میں سے مجلس وحدۃ المسلمین کو اپنے ساتھ ملا لیں اور انتخابات میں انہیں کچھ نشستیں بھی دے دیں۔

میری یہ بھی درخواست ہے کہ آپ انتخابات میں کسی معروف سیکولر اور لبرل شخص کو امیدوار نامزد نہ کریں تا کہ دین پسند ووٹر تحریک انصاف کے بارے میں منفی تاثر قائم نہ کرے جس طرح کہ سابقہ دور میں آپ نے شیریں مزاری، شفقت محمود اور فواد چوہدری جیسے سیکولر اور لبرل افراد کو اپنی ٹیم میں شامل کر لیا تھا۔

ڈاکٹر فرید احمد پراچہ کے نام

مجھے کل ہی پتا چلا کہ آپ جماعت کی انتخابات کمیٹی کے ذمہ دار ہیں تو میرے ذہن میں آیا کہ آپ کو ایک تجویز بھیجوں۔ ملی مجلس شرعی کے اجلاسوں میں آپ سے ملاقات رہتی ہے اور میرا اندازہ ہے کہ آپ اختلاف رائے سن بھی لیتے ہیں اور اسے برداشت بھی کر لیتے ہیں۔

عرض یہ ہے کہ جماعت زیادہ سے زیادہ امیدوار انتخابات میں کھڑے کرتی ہے اور اس کا جواز یہ پیش کرتی ہے کہ اس طرح اسے اپنی دعوت عوام تک پہنچانے کا موقع ملتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ کام تو اسے ۱۲ مہینے اور ہمیشہ کرنا چاہیے لیکن انتخابات تو نشستیں جیتنے کے لیے ہوتے ہیں اور ہر پانچ سال بعد دو تین مہینوں کے لیے آتے ہیں لہٰذا جماعت کی انتخابی سٹریٹجی نشستیں جیتنے کی ہونی چاہیے نہ کہ دعوت پھیلانے کی۔ یہ تو دعوت کے نتائج سمیٹنے کا وقت ہوتا ہے نہ کہ دعوت پہنچانے کا۔ لہٰذا جماعت کو چاہیے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں ہر جگہ صرف

دس دس نشستیں جیتنے کا ہدف اپنے سامنے رکھے اور جماعت کی ساری قوت اور سارے وسائل ان دس نشستوں کے جیتنے پر لگادے۔اس کے نتیجے میں اگر پانچ پانچ نشستیں بھی جماعت ہر اسمبلی میں جیت جائے تو یہ جماعت کی سابقہ کارکردگی کو دیکھتے ہوئے بڑی کارکردگی ہوگی۔

مَیں چونکہ جماعت کا خیرخواہ ہوں اس لیے جس بات کو جماعت کے لیے درست اور مفید سمجھا، وہ آپ تک پہنچادی۔آگے آپ کی مرضی۔

مدیر البرہان کے نام (از پروفیسر عبدالخالق سہریانی، کندھ کوٹ، سندھ)

مَیں نے تازہ البرہان میں احیائے اسلام پر سیمینار کی کارروائی کی رپورٹ کا مطالعہ بڑے غور اور اشتیاق سے کیا۔شرکاء اجلاس نے آپ کے پیش کردہ نکات پر گفتگو فرمائی۔اگر ان کی تجاویز کا خلاصہ ایک مشترکہ اعلامیہ کی صورت میں دیا جاتا تو ان کی جانب سے پیش کردہ حکمتِ عملی کا ایک واضح تصور سامنے آجاتا۔

آپ ایک عرصہ سے اس موضوع پر دعوتِ فکر دے رہے ہیں مگر اب تک آپ کی پیش کردہ فکر کے بارے میں کوئی واضح اور متفقہ رائے قارئین البرہان کی جانب سے سامنے نہیں آئی۔ حالیہ سیمینار کے شرکاء نے جن تجاویز کا ذکر کیا ہے ان کا آپ کے مجوزہ ایجنڈا سے کتنا تعلق ہے، اس کا آپ اگر تجزیہ اور محاکمہ فرماتے تو ان تجاویز کی افادیت معلوم ہوجاتی۔

احیائے اسلام اور اسلامی نظام حکومت کے قیام کے بارے میں غور وفکر کے لیے مسجد کا پلیٹ فارم زیادہ مناسب تھا۔فلیٹیز کا ٹھنڈا ماحول اس موضوع کے لیے شاید مفید ثابت نہ ہوا ہو۔

آپ کے مجوزہ فکری اور عملی منصوبہ کے بارے میں ایک نئی تحریک کا آغاز ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ موضوع کی افادیت اور اہمیت واضح ہو کر قوم کے سامنے آجائے اور پاکستانی قوم اور اس کے دینی ادارے اپنا کردار ادا کرسکیں۔اس تحریک کے نتیجہ میں فرد کی اصلاح اور اس کے بعد معاشرے میں فکری تبدیلی کا آغاز ہوجائے گا۔اس کے بعد پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کا راستہ ہموار ہوجائے گا اور وہ آپ کی فکر کے مطابق پُرامن راستہ ثابت ہوگا، پھر انقلابِ قیادت کے لیے کسی مزاحمتی یا جہادی تحریک کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔امید ہے کہ آپ میری تجویز پر ضرور غور فرمائیں گے۔شکریہ (بقیہ صفحہ نمبر: ۵۸)

یادرفتگان پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

جسٹس ڈاکٹر محمد الغزالی مرحوم
باتیں ان کی یاد رہیں گی

۱۷/ دسمبر ۲۰۲۳ء کو اسلام آباد میں ''عصرِ حاضر میں احیائے اسلام'' کے موضوع پر ہمارا ایک سیمینار تھا جس کے سبب ڈاکٹر غزالی صاحب سے اِن دنوں قریبی رابطہ تھا۔ پہلے رابطہ پر ہی انہوں نے کہا کہ وہ ان شاء اللہ اس میں گفتگو کریں گے۔

بحیثیت استاد و مربی وہ نرمی کی بجائے صاف گوئی کے قائل تھے۔ مجھے انہوں نے ٹوک دیا کہ تم نے اپنے دعوت نامے میں اپنے نام کے ساتھ پروفیسر اور ڈاکٹر کیوں لکھا ہے؟ پھر جب مَیں نے پروگرام فائنل کرلیا تو مَیں نے ان کے نام کے ساتھ جسٹس (ر) لکھ دیا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ مجھے تو اس کی خبر نہیں کہ میں ریٹائرڈ ہو گیا ہوں، آپ کو کس نے بتایا؟ پھر کہا کہ فلاں آدمی کو کیوں مرکزی حیثیت دے کر سیمینار میں بلوایا ہے۔ مَیں نے جمعہ ۱۵/ دسمبر کو انہیں اپنے میسج میں عذر پیش کیا اور لکھا کہ ''ناگفتنی یہ ہے کہ آپ بہت نیک ہیں، بہت عظیم ہیں لیکن بحیثیت مربی حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی طرح ذرا سخت ہیں اس لیے آپ سے ڈر بھی لگتا ہے۔''

ہفتہ ۱۶/ دسمبر کو انہوں نے میرے میسج کے جواب میں لکھا کہ ''جزاکم اللہ خیرا، میری اس گزارش کا اس قدر مثبت جواب دیا آپ نے۔ الحمد للّٰه حمدًا كثيرًا طيبًا مباركًا فيه۔ یہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ مخلصانہ کاوش میں لگے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائے اور مفید بنا دے۔ مَیں پھر عرض کروں گا کہ کسی ترکیب سے علامہ احمد جاوید صاحب مدظلہ العالی ودامت برکاتہ کی تشریف آوری کو یقینی بنایا جائے تو اس محفل میں بڑی برکت ہو۔ وہ میرے پاس قیام فرمائیں، سعادت ہوگی، میں انہیں لے آؤں گا، ان شاء اللہ العزیز۔''

انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ۱۲ بجے کے قریب سیمینار میں پہنچ جائیں گے۔ جب وہ تشریف نہیں لائے تو مَیں نے انہیں میسج کیا کہ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور زاہد اقبال صاحب (منتظم سیمینار) کو کہا کہ غزالی صاحب کو فون کریں۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب

نے جوابی میسج میں کہا ہے کہ ان کی طبیعت خراب ہے اس لیے نہیں آ سکتے۔

مَیں نے اسے زیادہ سیریس نہیں لیا۔ پیر ۱۸ر دسمبر کو ایک ساتھی نے مشورہ دیا کہ غزالی صاحب کی تیمارداری کے لیے چلا جائے۔ مَیں نے کہا پروگرام بناتے ہیں۔ پھر ایک دن میں بہت زیادہ لوگوں سے ملاقات کی خواہش میں وقت گزرتا گیا۔ شام میں مدثر رشید صاحب نے اچانک پوڈ کاسٹ پر میرے انٹرویو کا پروگرام بنالیا اور بحث ومناقشہ میں عشاء کا وقت ہو گیا۔ ہم بھاگم بھاگ ڈائیوو کے اڈے پر پہنچے اور عازمِ لاہور ہوئے۔ راستے ہی میں تھے کہ واٹس ایپ پر پتا چلا کہ غزالی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ بات سن کر یقین نہ آیا اور بڑی دیر تک انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا رہا اور بعد میں ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہا۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ اپنی نوعیت کے منفرد آدمی تھے۔ یہ دونوں بھائی ہی (ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم اور ڈاکٹر غزالی صاحب) باکمال تھے۔ علم میں گہرا رسوخ لیکن مزاج میں دونوں مختلف تھے۔ ایک سراپا جمال اور دوسرے سراپا جلال۔

غزالی صاحب کا زندگی کے آخری حصے میں تزکیہ وتصوف کی طرف میلان شدید ہو گیا تھا بلکہ یہ میلان شروع ہوا تو ہر وقت تسبیح ہاتھ میں رکھتے اور اسے استعمال کرتے تھے۔ داڑھی بھی غالباً بڑھالی تھی۔ پھر یہ میلان معتدل ہو گیا۔ وہ ہم عصر معروف مربی احمد جاوید صاحب کے گرویدہ تھے اور ان سے رابطے کے لیے مجھے وسیلہ بناتے تھے اور انھوں نے غالباً احمد جاوید صاحب کے اسلامی یونیورسٹی میں محاضرات بھی کروائے تھے۔ مجھ سے برابر مطالبہ کرتے رہے کہ احمد جاوید صاحب کو اسلام آباد والے سیمینار میں بلواؤں۔ مَیں نے اس لیے ان کے اس مطالبے کو زیادہ سنجیدہ نہ لیا کہ احمد جاوید صاحب ہمارے اس موضوع پر سیمینار میں لاہور میں تشریف لا چکے تھے اور 'البرہان' کے دسمبر کے شمارے میں ان کا خطاب (تلخیص کے ساتھ) شائع بھی ہو گیا تھا۔ نیز یہ کہ میرے علم میں ہے کہ احمد جاوید صاحب کی کمر کے کئی آپریشن ہو چکے ہیں اور ڈاکٹروں نے انہیں سفر میں احتیاط کا مشورہ دے رکھا ہے۔ لیکن وہ آخر وقت تک مجھ سے اصرار کرتے رہے کہ جناب احمد جاوید صاحب کو اس سیمینار میں بلواؤ۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ اس بہانے احمد جاوید صاحب جیسے مربی سے ان کو استفادہ کا موقع ملے گا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۲۹)

عالمِ اسلام/افغانستان ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

افغان معیشت - استحکام فروغ پا رہا ہے

افغان معاشی پالیسی کے خلاف سامراجی پروپیگنڈا میں کچھ کمی آئی ہے۔ اس کی وجہ خود سامراجی اداروں بالخصوص ورلڈ بینک کی وہ رپورٹیں ہیں جو مستقلاً افغان معیشت کی کارکردگی کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ آج افغان معیشت کی زبوں حالی ایک من گھڑت افسانہ بن گئی ہے۔

ورلڈ بینک کی اکتوبر 2023ء کی ماہانہ رپورٹ کے مطابق معاشی استحکام ہے۔ افغانی کی شرح تبادلہ (rate of exchange) مستقل بڑھ رہی ہے اور اس سال کے پہلے دس ماہ (جنوری تا اکتوبر 2023ء) میں افغانی کی شرح تبادلہ امریکی ڈالر کے مقابلہ میں 20 فیصد، یورو کے مقابلہ میں 19 فیصد، چینی یوآن کے مقابلہ میں 16 فیصد، پاکستانی روپیہ کے مقابلہ میں 34 فیصد اور ایرانی تومان کے مقابلہ میں 60 فیصد بڑھی۔ اس اضافہ کی سب سے بڑی وجہ بیرونی ممالک سے ترسیلِ زر میں مستقل اضافہ ہے کیونکہ اقوام متحدہ سے حاصل شدہ امدادی ڈالروں کی مقدار مستقل کم ہو رہی ہے اور 2023ء کے پہلے دس مہینوں میں ڈیڑھ ملین سے بھی کم ہو گئی ہے۔ ان شاء اللہ چند سالوں میں اسلامی حکومت اس امداد سے مکمل نجات حاصل کر لے گی۔

قیمتوں میں استحکام قائم ہے۔ ستمبر 2023ء کو افراط زر کی شرح منفی 9 فیصد ہو گئی۔ غذائی اشیاء کی قیمتیں 13 فیصد اور غیر خوردہ اشیا کی قیمتیں 6 فیصد کم ہوئیں۔ ورلڈ بینک کے مطابق رسدی صورت حال بہتر ہوئی ہے اور تمام مارکیٹوں میں خوردنی اور غیر خوردنی اشیا کی طلب رسد کے برابر ہے۔ تقریباً ہر مارکیٹ میں ستمبر 2023ء میں رسد طلب کے 99 فیصد رہی۔

ان اعداد و شمار سے اقوام متحدہ کے افغان ویلفیئر سروے کے اس جھوٹ کا پول کھل جاتا ہے کہ افغانستان میں 13 ملین افراد بھوکوں مر رہے ہیں۔ اسلامی حکومت کے انتظامی اخراجات میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے اور بیرونی تجارتی محصولات 2023ء کے پہلے نو مہینوں میں 0.5 فیصد کم ہوئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ پاکستان کی برآمدات میں کمی ہے۔ اس دوران کوئلے کی برآمدات 37 فیصد کم ہوئیں۔ پاکستان کی عبوری حکومت امریکا کی شہ پر افغانستان کے لیے مستقل مشکلات پیدا کر رہی ہے۔ پاکستان افغان برآمدات کا تقریباً 55

فیصد خریدتا ہے لیکن 2023ء میں افغانستان کی پاکستانی درآمدات 15 فیصد کم ہوئی ہیں۔ پاکستان نے ٹرانزٹ ٹریڈ پر بھی پابندیاں عاید کردی ہیں اور افغان مہاجرین کی بے دخلی سے بھی افغان معیشت کو کمزور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

2023ء کے پہلے دس ماہ میں افغانستان سے خوردنی اشیا کی برآمد میں 11 فیصد اور کپڑوں کی برآمدات میں 44 فیصد اضافہ ہوا۔ سبزی کی برآمدات بہت تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ افغان درآمدات بھی مستقل بڑھ رہی ہیں۔ 2023ء کے پہلے دس ماہ میں ان کا حجم تقریباً 6 ملین ڈالر رہا اور ایران سب سے بڑا درآمدی مرکز ہے جس کا حصہ افغان درآمدات میں 2023ء کے پہلے دس ماہ میں 25 فیصد رہا اور مالیاتی استحکام بھی موجود ہے۔ مجموعی حکومتی محصولات مستقل بڑھ رہے ہیں اور ان کا حجم جنوری تا اکتوبر 2023ء میں تقریباً 102 ملین افغانی ہوگیا۔ پاکستان کی عائد کردہ پابندیوں کے نتیجہ میں بیرونی تجارتی محصولات صرف ایک فیصد 2023ء کے پہلے دس ماہ میں بڑھیں لیکن اندرونی محصولات میں شرح اضافہ اس سے زیادہ ہے۔

بینکوں سے اخراجِ زر پر پابندیاں مستقل کم کی جارہی ہیں۔ جو اکاؤنٹ 2021ء اگست کے بعد کھولے گئے ان پر کوئی پابندی عائد نہیں۔ اس سے پہلے کھولے ہوئے اکاؤنٹس پر شرحِ انخلا ہفتہ وار پچاس ہزار افغانی کردی گئی ہے۔ ماہانہ اخراجی حد کاروباریوں کے لیے بڑھا کر چار ملین افغانی کردی گئی ہے۔ ورلڈ بینک کے مطابق تمام سرکاری ملازمین تنخواہ وقت پر حاصل کررہے ہیں اور ان میں سے 90 فیصد بینکوں کے ذریعہ تنخواہ حاصل کرتے ہیں۔ اجرتی نظام میں بھی استحکام ہے۔ مارچ 2023ء کے بعد سے اکتوبر 2023ء تک پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ ملازمتوں میں اضافہ ہورہا ہے اور ذرائع پیداوار میں بھی ترقی نمایاں ہے۔

ورلڈ بینک کی تخریب کارانہ سرگرمیاں جاری ہیں۔ وہ بڑے پیمانے پر initiatives اور سروسز کے ذریعہ اطلاعات جمع کرتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں Third Party Monitoring Agency اطلاعاتی تخریب کاری کا اہم ذریعہ ثابت ہورہی ہے۔ اسلامی حکومتی انتظامیہ نے ایک مثالی عدالتی نظام قائم کرکے کرپشن کا خاتمہ کردیا ہے جس کی بدولت وہاں معاشی استحکام قائم ہوگیا ہے۔ سامراج اس استحکام کو تباہ کرنے کا ذریعہ ہے اور سامراجی اطلاعاتی اور انتظامی تخریب کاری کو روکنے کے لیے ورلڈ بینک نیٹو کے ہیومینٹرین گروپ اور اقوام متحدہ کے اداروں کی عمل داری کو محدود کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

عالم اسلام/ترکی

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

ترکی میں اسلامی ماڈرنزم کی فتح

اسلامی تحریکوں کے لیے لمحہ فکریہ

طیب اردگان 2023ء کے قومی انتخابات میں ایک قلیل اکثریت کی بنیاد پر جیت گئے۔ ان کے ووٹوں میں پچھلے تمام انتخابات کی طرح اس مرتبہ بھی نمایاں کمی واقع ہوئی اور اس قلیل اکثریت کو حاصل کرنے کے لیے انہیں دائیں بازو کے شدت پسند قوم پرست عناصر سے مصالحت کرنا پڑی۔ پچھلی دہائی سے ان کی جماعت (AKP) کی عوامی نمائندگی اور حمایت میں مستقل کمی واقع ہو رہی ہے اور مخالف دہریہ سیاسی قوتیں مستحکم سے مستحکم ہوتی جا رہی ہیں۔

لیکن AKP کی سیاسی اور سماجی بنیادیں مضبوط ہیں اور ترکی میں مخلصینِ دین کی بہت بڑی اکثریت اس جماعت کے نظری بیانیہ کو قبول کرتی ہے اور اس کی سیاسی کامیابیوں کو اپنی فتح تصور کرتی ہے۔ ان سیاسی کامیابیوں کے نتیجے میں ترکی معیشت اور ریاستی نظام تیزی سے ماڈرنائز (Modernize) ہو رہا ہے۔ لیکن ماڈرنائزیشن کے اس عمل کی معاشرتی بنیادیں ترکی کی اسلامی روایات اور ثقافت میں پیوست ہیں اور یہی پیوستگی ماڈرنائزیشن کے اس عمل کی عوامی مقبولیت کا ایک سبب ہے۔

ماڈرنائزیشن کیا ہے؟

ماڈرنائزیشن اس معاشرتی عمل کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی تہذیب پر سرمایہ دارانہ تعقل (Capitalist Rationality) غالب کیا جاتا ہے۔ ماڈرنائزڈ معاشروں میں سرمایہ دارانہ عدل کا حصول مقدم سیاسی اور سماجی ہدف کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ اور انفرادی اور اجتماعی عمل کو اسی واحد ہدف کے حصول کے ذریعہ کے طور پر منظم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ماڈرنزیشن کا یہ عمل تحریک نشأۃ ثانیہ کے وقت سے یورپ میں شروع ہوا اور اس تحریک کا پہلا شکار عیسائی تہذیب تھی۔ عیسائی علمیت اور ثقافت کو ماڈرنائز کرنے کا عمل ویسے تو اس شہری انتظامیہ میں جاری رہا جو 12 ویں صدی کے بعد سے جرمنی، ہالینڈ اور اٹلی میں گاہے

بگاہے قائم ہوتی رہیں لیکن پہلی مکمل عیسائی ماڈرنائزڈ ریاستیں (Cromwell) نے انگلستان اور (Calvin) نے سوئٹزرلینڈ میں 17 ویں صدی میں قائم کیں۔ ان ریاستوں نے عیسائیت کی قوم پرست تشریح کی۔ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اور سودی کاروبار کو فروغ دے کر رائج کیا اور سامراجی فتوحات کی راہ ہموار کی۔ عیسائی علمیت کی ماڈرنائزڈ تشریحات ابتداءً ڈیکارٹ (Descartes) اور کانٹ (Kant) کی فکر میں ملتی ہیں۔ یوں ماڈرنائزیشن کے ذریعے عیسائی تہذیب کو سرمایہ دارانہ معاشرت میں سمویا گیا اور عیسائی ماڈرنائزڈ ریاستیں بتدریج سیکولر ریاستوں میں تبدیل ہوگئیں۔ اس تبدیلی کے انقلابی سرمایہ دارانہ سنگ میل 1688ء (انگلستان)، 1776-1783ء (امریکہ) اور 1789ء (فرانس) ثابت ہوئے۔ ماڈرنائزیشن سے مراد وہ معاشرتی عمل ہے جو مذاہب عالم کی سرمایہ کاری کی جستجو کرتا ہے۔ اس سرمایہ کاری کے دو پہلو ہیں: ایک تو یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظاماتی اہداف مذہبی اقدار سے ہم آہنگ ہیں یعنی آزادی، مساوات، ترقی، ہیومن رائٹس ویلفیئر اور سائنٹفک میتھڈ (Scientific Method) سب کا جواز مذہبی نصوص میں پیوست ہے۔ مذہب کا تقاضا ہے کہ نظاماتی زندگی (Public Life) حصولِ آزادی اور ترقی، فروغِ ہیومن رائٹس، تجارتی، اخلاق اور سائنسی منہج (سائنٹیفک میتھڈ) کے غلبہ کی جستجو کی جائے اور یوں ایک ماڈرن طاقتور جارح قوم بنائی جائے۔

دوسری جانب مذہبی ماڈرنائزڈ ریاستیں دعوی کرتی ہیں کہ سیکولر نظام عمومی (public life) ذاتی زندگی میں مذہبی روایات اور طرز ہائے زندگی فروغ پا سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معاشرت سیکولر انہی معنوں میں ہے کہ وہ ذاتی زندگی (personal life) میں اظہارِ ذات کے وافر مواقع فراہم کرنے کا وعدہ کرتی ہے۔

حکومت نے آزادیاں دے رکھی ہیں
ترقی کی راہیں ہر اِک سُو کھلی ہیں

نمازیں پڑھو بے دھڑک مسجدوں میں
اذانیں دھڑلے سے دو معبدوں میں

(جاری ہے)

عالمِ اسلام / چین

ارسال کردہ: مولانا محمد عمر [۱]

چین میں مسلمانوں کی حالتِ زار

ایک مسلمان طالب علم نے جو چین میں پڑھتا ہے یہ تحریر مجھے بھیجی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ چین بھی مسلمانوں سے نفرت میں نصاریٰ اور یہود و ہنود و دیگر کفار سے کم نہیں۔

’’چین میں نسلی بنیاد پر 52 قومیں آباد ہیں۔ جن میں سے ہان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ جس شہر میں مَیں رہ رہا ہوں وہاں مسلمان یا تو کا ذخ ہیں یا یغور یا منگول۔ ہوسکتا ہے اور بھی ہوں مگر مجھے اس سے زیادہ نہیں معلوم۔

ہمارے شہر میں، میری معلومات کے مطابق، صرف ایک مسجد ہے جو صرف جمعہ اور عیدین کی نماز کے لیے کھلتی ہے۔ جمعہ کے لیے مسجد میں داخل ہونے کے لیے ہمیں اپنا شناختی کارڈ یا پاسپورٹ گیٹ پر موجود چوکیدار یا یونیورسٹی کی طرف سے موجود استاد کو جمع کروانا ہوتا ہے جس کے بعد ہمیں اندر مسجد کے صحن میں قطاروں میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کا وقت دو سے ڈھائی بجے کے درمیان ہے۔ اس کے بعد دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ صحن کی دیواروں پر کارٹون بنے ہوئے ہیں جن میں چینی مرد اور عورتیں اپنے ثقافتی لباس میں موسیقی کے آلات بجاتے ہوئے اور ناچتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ مسجد کی تصاویر لینا سختی سے منع ہے۔ آپ کو اس شہر میں پولیس نظر نہیں آئے گی مگر مسجد میں پولیس موجود ہوتی ہے، یہاں تک کہ نماز کے دوران بھی دو پولیس والے وہاں موجود ہوتے ہیں۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد ہم غیر ملکی طلباء کو امام کے دائیں طرف بٹھا دیا جاتا ہے جب کہ چینی مسلمان بائیں طرف بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہم طلباء کو ہدایت دی گئی تھی کہ مسجد میں بیٹھے چینیوں سے تھوڑا فاصلے پر بیٹھیں اور ان سے بات کرنے سے گریز کریں۔ اور اس فاصلے کو پولیس والا قائم کراتا ہے۔ امام پہلے چینی زبان میں لکھا ہوا خطبہ پڑھتا ہے اور پھر معمول کے مطابق عربی میں خطبہ دیتا ہے۔ اس کے بعد معمول کے مطابق نماز ادا ہوتی ہے۔

---

[۱] ردِّ الحاد فورم

اس سب میں سب سے غیر معمولی چیز جس کی جانب آپ سب سے پہلے متوجہ ہوں گے، وہ یہ ہے کہ وہاں موجود چینیوں میں آپ کو سارے بوڑھے نظر آئیں گے اور ایک بھی چینی نوجوان نہیں ہوگا۔ یہ بات بہت اہم ہے۔چینی مسلمانوں کی نئی نسل اپنے آپ کو مسلمان تو کہتی ہے مگر اسلام کی پابندیوں اور قوانین سے بالکل ناواقف ہے۔اور اس نسل میں زیادہ تر نوجوان اپنے آپ کو غیر مذہبی کہتے ہیں، یعنی والدین مسلمان اور اولاد غیر مذہب۔شاید یہی وجہ ہے کہ جب یہ بڑے ہمیں دیکھتے ہیں تو نہایت شفقت اور گرم جوشی سے ملتے ہیں کیونکہ ان کی اولادیں دین سے مکمل طور پر علیحدہ ہیں۔اسی وجہ سے جو مسلمان یہاں نظر آتے ہیں وہ زیادہ تر ضعیف یا درمیانی عمر کے ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کی پہچان اس طرح ہوتی ہے کہ مردوں نے سر پر ٹوپی اور خواتین نے سر پر کپڑا باندھا ہوتا ہے۔اس کے برعکس ہم طلباء کو داڑھی رکھنے اور طالبات کو حجاب کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔جن لڑکیوں کو پردے کا شوق ہے وہ فیس ماسک اور سر پر ٹوپی سے گزارا کرتی ہیں۔ہاسٹل میں ہمیں جائے نماز اور قرآن رکھنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔اور نماز پڑھتے وقت دروازہ بند کرنا پڑتا ہے لیکن ہاسٹل کے عملے کے پاس کمرے کی چابی ہوتی ہے اور بتائے بغیر کسی بھی وقت کمرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔مہینے میں کم از کم دو تین بار تو اس طرح کے چھاپے پڑتے ہیں۔''

عالمِ اسلام/سوڈان مدیر

سوڈان کی خانہ جنگی

سوڈان کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ وہاں دو جرنیلوں میں اقتدار کے لیے باہم جنگ ہو رہی ہے لیکن لوگوں کی یہ رائے مغرب اور اس کے میڈیائی پروپیگنڈا کی جھوٹی مہم پر مبنی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس خانہ جنگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغرب اور اس کے حمایت یافتہ گروہ ساری دنیا میں عموماً اور (اس وقت زیرِ بحث) سوڈان میں خصوصاً اس لیے جدوجہد کر رہے ہیں تا کہ ریاستی نظم و نسق میں دینی جماعتوں کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔

یاد رہے کہ دیگر کئی مسلم ممالک کی طرح سوڈان بھی ان بدقسمت ممالک میں شامل ہے جہاں فوج ملک پر قبضہ کرلیتی ہے۔ سیاسی جماعتیں برسوں کی سیاسی جدوجہد سے انہیں ہٹاتی ہیں تو چند برس بعد کوئی دوسرا فوجی سربراہ کسی بہانے اقتدار پر قبضہ کرلیتا ہے۔ عمرالبشیر نے بھی بطور ایک فوجی افسر سول حکومت کو برطرف کرکے ۱۹۹۳ء میں اقتدار سنبھالا اور تیس سال تک ملک پر حکومت کی۔ پچھلے کئی سالوں سے ملک کے دینی عناصر خصوصاً اخوانی فکر کے حامل ڈاکٹر حسن الترابی اور ان کی جماعت (جبهة الميثاق الإسلامية اور بعد میں الجبهة الإسلامية القومية) شامل اقتدار تھے۔ طرزِ حکومت نیم آمرانہ تھا۔ عمرالبشیر چونکہ ۳۰ سال سے حکمران تھے، ملک میں مہنگائی اور معاشی ابتری تھی، چنانچہ ہنگامے شروع ہوگئے اور فوجی حکمران جنرل عبدالفتاح برہان نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ سول حکومت کے حامیوں نے جب سیاسی حکومت کی بحالی کے لیے مظاہرے شروع کردیے تو جنرل برہان نے سول فوجی مشترک حکومت قائم کردی اور دوسال کے اندر انتخابات کراکر سول حکومت بحال کرنے کا اعلان کردیا۔ اس پر فوج کے ایک ذیلی نیم خودمختار ادارے (پیراملٹری رَیپڈ سپورٹ فورسز) کے کمانڈر محمد حمدان دگالو نے بغاوت کردی۔

دونوں فوجی اداروں کے سربراہوں کے درمیان اس خانہ جنگی سے سوڈان میں پچھلے ۸ ماہ میں ۹ ہزار سے زیادہ شہری ہلاک ہوچکے ہیں، ۵۶ لاکھ سے زیادہ افراد بے گھر ہوچکے ہیں۔ ہزاروں عمارتیں منہدم ہوچکی ہیں، عوام کی بری حالت ہے، دارالحکومت خرطوم پر بھی متحارب گروپوں کا جزوی قبضہ ہے۔ اقوامِ متحدہ کا ادارہ زبانی کلامی دعوؤں سے آگے نہیں بڑھا۔ سعودی عرب نے متحارب گروپوں میں صلح کی کوشش کی جو کامیاب نہیں ہوئی۔ بگاڑ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رَیپڈ فورسز کے حامی لبرل اور کمیونسٹ گروہ کسی قیمت پر دینی گروہوں کو اقتدار میں حصہ دینے پر آمادہ نہیں۔ انہوں نے ملک کی مکمل اوور ہالنگ کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کیا ہے جس کی رو سے سوڈان ہر طرح کے امتیاز کے خاتمے (یعنی عورت و مرد کی مساوات) کے کنونشن پر دستخط کرے گا۔ ہم جنس پرستوں کے حوالے سے بے جا سخت گیری نہیں ہوگی، معاہدۂ ابراہیمی کے تحت اسرائیل سے تعلقات معمول پر لائے جائیں گے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بین الاقوامی طاقتیں سوڈان کو کس رخ پر چلانے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔

کتاب نما حافظ محمد عمران طحاوی

تبصرۂ کتب

ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست (مرتبین: محمد جلال الدین قادری وظہور الدین امرتسری)

تاریخ علم کا ایک ذریعہ ضرور ہے تاہم سب یہ مانتے ہیں کہ یہ ذریعہ مستند نہیں۔ تاریخ میں استناد کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ مؤرخ وقت کے ساتھ تخت وطاقت کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ برصغیر کی مسلم آزادی کی تاریخ میں بھی ہمارے بعض لیڈرز جو دوقومی نظریہ کے حامی نہ تھے بلکہ تقسیم ہندوستان سے پہلے ان کی تمام جدوجہد متحدہ ہندوستان کے لیے ہی تھی انہیں ہیروز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخی دستاویزات کے حوالہ جات سے اس کتاب میں ان کی قلعی کھولی گئی ہے۔ اگرچہ بہت سے مضامین تشنہ ہیں مگر تحریک پاکستان کی تاریخ میں ایک اضافہ ہے۔

ناشر: ادارہ پاکستان شناسی، سوڈیوال کالونی، ملتان روڈ، لاہور، قیمت 300 روپے۔

فون: 0322-4005952

تعلیماتِ اسلام (حافظ عتیق الرحمٰن گورچانی)

مولانا گورچانی نوجوان عالمِ دین ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں دینی مدارس کے ساتھ سکول وکالج کے طلبہ کے لیے ۲۰ عدد دروس سوالاً جواباً مرتب کیے ہیں جن کا آغاز ایمانیات سے ہوتا ہے اور تاریخ پاکستان پر مکمل ہوتا ہے۔ آسان اور سہل انداز میں باحوالہ علمی مواد اکٹھا کیا ہے جو ہر عمر اور پیشہ کے لوگوں کے لیے مفید ہے اور تمام طرح کے تعصب اور فرقہ پرستی سے پاک ہے۔

ہدیہ 300 روپے، ملنے کا پتہ: جامعہ اصحاب صفہ کوئٹہ روڈ، ڈیرہ غازی خان

فون: 0313-5265617

minorities).

2. At the social level an attempt to gather Muslim communities around mosques and *madrasahs* which are the natural focal points for the promotion of Islamic virtues – *ihsaan* (احسان), *infaq* (انفاق), *tawakul* (توکل), *sabar* (صبر). Unfortunately this is the weakest element of our endeavour to counter the dominance of capital. We have so far not been able to reorient the economic life (which is still overwhelmingly dominated by capital) of Muslim communities anywhere except in the Islamic states recently established.

3. The weakness in social organization reflects our political disorganization. This political disorganization is being gradually overcome. Two Islamic states have been established in Iran and Afghanistan and Islamic revolutionary movements are active in Palestine, Iraq, Algeria, West and Central Africa. In these areas Islamic social organization is proceeding rapidly . Moreover both Iran and Afghanistan are disassociating from global capitalist order and are developing systems for wealth production unconstrained by the influence of capital.

Linking these three endeavours is of crucial importance. Without the growth of Islamic individuality, the Islamic political struggle for creating Islamic state cannot be sustainable. Without the establishment and functioning of Islamic state, social and economic organization of powerful Islamic communities is unprotected. Strategic leadership that synthesises these attempts at Islamic individuation, state formation and social organization is necessary for the success of the Islamic revolutionary struggle against the systemic domination of Capital.

and elsewhere. Social movements – environmental, peace, feminist, LGBT – are Foucauldian protesting not the rule of Capital as such but Capitalist injustices.

زمامِ کار گر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

It is no wonder that the followers of Deleuze, Derrida, Zizek and the 'New Materialists' reject all utopias - liberal and socialist – and proclaim that humanity is committing suicide. The circuit of Capital is being closed but, in their view, this closure will lead to the extinction of mankind and future life on earth.

The Islamic Revolutionary Response

We are Islamic revolutionaries. We are struggling to end the rule of Capital (the domination of *hirs* (حرص) and *hasad* (حسد) in the life of the individual and at the level of society and state). We argue that *hirs* (حرص) and *hasad* (حسد) are Satanic evil forces and their domination over individual, social and state levels is specific to Capitalist order. It is both possible and necessary to reject *hirs* (حرص) and *hasad* (حسد) at the individual, social and state level.

The following initiatives are being taken to uproot Capitalist rule by Islamic revolutionaries and their allies:

1. At the level of the individual Islamic knowledges and spirituality is being promoted so that *hirs* (حرص) and *hasad* (حسد) are rejected and the virtues of *infaq* (انفاق), *tawakul* (توکل), *sabr* (صبر) are promoted. The Ulema and the Sufia are at the forefront of this aspect of the Islamic revolutionary struggle against the rule of Capital. By the mercy and grace of Allah the ranks of the *mukhliseen-e-deen* are continuing to grow even in Europe and America where Islam is the fastest growing religion (especially among women and the racial

they argue that promoting democratic rule and universalizing constitutionalisation of human rights (as Habermas has suggested) can lead to the realization of Kant's perpetual peace and the authoritative globalization of Enlightenment values.

Marxists argue that overcoming capitalist crisis requires a transformation of the Capitalist property form. First state and eventually communal property must displace "private" property. Financial domination of production must end (Marxists regard financialisation – the subordination of production to the functioning of financial markets – as a major cause of the slowing down of *hirs* (حرص) and *hasad* (حسد) at the mass level with an unsustainable growth in the Capitalist class). Democracy must become real, not merely formal or representative. "Social individuals" must become substantially not just procedurally equal.

One is amazed at the idealism displayed by the materialists – as both neo Weberian and neo Marxist analysts claim to be. There is no evidence that technological fixes are making sustainable growth of *hirs* (حرص) and *hasad* (حسد) tenable (as COP28 shows the world is heading towards climate change disaster). Democratic regimes are collapsing throughout the world (in America, Hungary, Italy, Afghanistan, Denmark, Korea). Human rights imperialism – the slaughter in Gaza and Afghanistan and the proposed slaughter in Iran, North Korea and Taiwan has exposed the reality behind Habermas and Kant's proposals of constitutional republicanism.

There are no signs of the emergence of the Marxist utopia. The state is not "withering away" – quite the contrary. There is no global environmental proletariat. Communal property schemes have collapsed in Venezvela, Bolivia, China

Capital's crises have occurred with consistent regularity throughout its history – the most recent being the pandemic crisis of 2020-21, following the banking crisis of 2008-09. Today the most serious threats to the accumulation process are two. On the one hand the growth of *hirs* (حرص) and *hasad* (حسد) is increasingly constrained by natural environmental resource balances. Capital's own epistemology – science – is increasingly destroying the natural world which it regards as its sole domain of exercise.

On the other hand Capital is threatened by the impending collapse of global governance. US hegemony is being challenged regularly not just by superpowers – China and Russia – but by *mujahideen* and resistance forces in Capitalist peripheries - Afghanistan, Iran, Iraq, Palestine, Cuba, Venezuela etc. Rogue States – Russia, Israel, North Korea – are preparing to launch nuclear attacks on their neighbors. The manifest inability of Capital to transcend nationalism – to substitvte a global hegemonic state for a receding, senile, polarised America - is creating the possibility of turning the 'New Cold War' into a full fledged Third World War.

The neo-Weberian (liberal and social democratic) response to Capital's crisis is multifaceted but two similarities can be identified. Two themes are common to both representing a toughening faith in the efficiency of human rationality. On the one hand, most (perhaps all) neo Weberians believe in technological fixes. Science, they believe, can engender market solutions to address environmental imbalances, through carbon capture, alternative energy development, environmental engineering etc. to make sustainable growth of *hirs* (حرص) and *hasad* (حسد) never-ending. The human domination of nature can continue and "planetary boundaries" can be circumvented. Secondly,

Dr. Javed Akbar Ansari

Capital and its Crisis

What is Capital?

Capital has been defined variously. Max Weber defined it as "a stock of wealth". Karl Marx defined it as "social relation". Our master Hazrat Maulana Mohammad Marmaduke Pickthal defined it as "*Takathur*(تکاثر)– "rivalry in worldly increase".

These different conceptions of Capital lead to different conceptions of capitalist functioning. Weber saw capitalist growth as a consequence of the advance of human rationality. Marx saw Capital expansion as an unfolding of dialectics of historical materialism. Both Marx and Weber consider capital to be a material phenomenon expressing the essential materiality of (human) being and of Being itself.

In contrast our master Pickthall – may Allah bless him – sees capital as a spiritual not material manifestation. Capital is a spiritual force emanating in competition (حسد) and accumulation (حرص). This evil may or may not dominate man's thought and action and when it does it self-expands through its possession of material wealth. When Takathur (تکاثر) does not dominate man's being Capital cannot self-expand through wealth possession. Wealth remains one of the many bounties bestowed by Allah on mankind.

Conceptions of Capital's Crisis

These different conceptions of capital have led to different visualizations of capitalist crisis which may be defined as systemic disruptions – threatening termination – of the accumulation process – the endless growth of *hirs* (حرص) and *hasad* (حسد).